دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۸ ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۱ء عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ دنوں ایک سمینار میں شرکت کے لیے سفر برطانیہ کا اتفاق ہوا۔ یہ سمینار The Islamic Manuscript Association کی طرف سے کیمبرج یونیورسٹی کے Magdalene College میں ۱۲-۱۴ جولائی کو منعقد ہوا۔ یہ اس ایسوسی ایشن کا ساتواں سالانہ سمینار تھا اور جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے اسلامی مخطوطات کے لیے مخصوص تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کا یہ کالج کیم ندی (Cam) کے پل کے پاس واقع ہے۔ اسی ندی سے اس شہر کا نام ماخوذ ہے۔ اس کالج کی ابتداء ۱۴۲۸ میں ہوئی۔ ابتداءً یہ بکنگھم کالج کے نام سے موسوم تھا۔ ۱۵۵۲ میں اس کو موجودہ نام دیا گیا۔ قیام کالج کے احاطہ میں تھا البتہ پروگرام اسی کالج کی ایک نئی عمارت کرپس کورٹ میں تھا جو چند منٹ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ سمینار پرنس الولید بن طلال سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے تعاون سے منعقد کیا جاتا ہے۔ دراصل اس ایسوسی ایشن کی حیثیت اس سنٹر کے ایک متعلقہ ادارہ کی ہے۔ اس سمینار میں ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، ملیشیا، سعودی عرب، عمان، ابوظبی، دبئی، مصر، الجیریا، شام، ترکی، ازبکستان، روس، آسٹریلیا، ہنگری، اٹلی اور سینیغال کے علاوہ برطانیہ کی مختلف جامعات اور علمی اور تحقیقی اداروں کے مندوبین نے شرکت کی۔ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا سے متعلق خود ان خطوں میں اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں محفوظ مخطوطات کے ذخیروں کے تعارف کے علاوہ سمینار میں بحث و گفتگو کا ارتکاز مخطوطات کی دیکھ ریکھ اور حفاظت کے مختلف پہلوؤں پر رہا اور اس سلسلہ میں جدید ٹکنالوجی کی مختلف جہات زیر بحث رہیں۔ زیر بحث موضوع پر معلومات کے علاوہ اس نوع کی علمی مجالس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ممالک سے آنے والے محققین سے ملاقات اور تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ راقم حروف کو دارالمصنّفین میں محفوظ مخطوطات کے تعارف اور ان کی حفاظت کی نسبت سے کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں گفتگو کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان امور پر گفتگو سے پہلے مختصر طور پر علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کا تعارف کرایا گیا۔ حیرت اور خوشی اس بات پر تھی کہ وسائل کی تمام تر کمیابی کے باوجود دارالمصنّفین میں مخطوطات کی حفاظت کے سلسلہ میں جو بعض بنیادی نوعیت کے اقدامات کیے جاچکے ہیں وسائل سے مالا مال بہت سے ادارے ابھی ان سے بہت دور ہیں۔ متعدد شرکاء نے دارالمصنّفین کے سلسلہ میں گہری دلچسپی ظاہر کی اور وہاں آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

مخطوطات ہماری علمی اور تہذیبی وراثت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہ وراثت جتنی گراں مایہ ہے اس کی حفاظت اتنی ہی مشکل اور اس کے اتلاف کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہیں۔ ایشیائی ممالک میں خاص طور سے

جغرافیائی اور موسمی اسباب کی وجہ سے مخطوطات مستقل خطرات کی زد میں رہتے ہیں اور ذرا سی لاپرواہی سے صدیوں کا سرمایہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔مخطوطات کی دیکھ ریکھ اب ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ اس سے ناواقفیت اور اس سے بھی زیادہ اس کے لیے درکار وسائل کے فقدان کے باعث بہت سے اداروں کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔اس خلا کو پر کرنے کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں جو ادارے کام کررہے ہیں ان میں اس ایسوسی ایشن کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔اس نوع کا اور اس انداز پر کوئی اور ادارہ اس میدان میں کام نہیں کررہا ہے۔اس کا میدان کار اسلامی مخطوطات ہیں اور اس موضوع پر یہ ایسوسی ایشن بڑا وقیع کام کررہی ہے۔کیمبرج یونیورسٹی اور تھیسارس اسلامیکس،قاہرہ کے تعاون کی وجہ سے اس کی پہنچ اور اس کے وسائل میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔اس سلسلہ میں آن لائن رہنمائی اور معلومات کی فراہمی کے علاوہ،ٹریننگ ورکشاپ اور سالانہ سمینار کا اہتمام اس کی مستقل سرگرمیوں کے اہم اجزاء ہیں،مخطوطات کی حفاظت کے لیے ممبر اداروں کو معقول گرانٹ اور اس موضوع پر مطالعہ اور تحقیق کے لیے اسکالرشپ کی فراہمی بھی اس پروگرام میں شامل ہے۔ اس سال سمینار کے موقع پر ایسوسی ایشن نے مخطوطات کے موضوع پر ایک علمی اور تحقیقی مجلّہ کی اشاعت کی ابتداء کی ہے۔یہ سمینار ہر سال جولائی میں کیمبرج میں منعقد ہوتا ہے۔اگلے سال کے سمینار کا موضوع سائنسی مخطوطات ہیں۔

سمینار کے بعد لندن میں پانچ دن قیام کا پروگرام تھا۔لندن جیسے شہر کے لیے یہ وقت بہت کم تھا۔لیکن اس مختصر وقت میں نہ صرف یہ کہ سرسری طور پر ہی سہی لندن کی اہم جگہوں کو دیکھنے کا موقع ملا بلکہ لندن اور لندن کے باہر بعض علمی اور اسلامی اداروں کو دیکھنے اور ان کے ذمہ داروں سے ملاقات کی گنجائش بھی نکل آئی ۔ یہ دراصل میرے میزبان ڈاکٹر راشد ایوب اصلاحی صاحب کی دلچسپی اور منصوبہ بندی کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔راشد صاحب ایک مدت سے لندن میں مقیم ہیں اور وہاں کے اسلامی حلقوں میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔دوسری مصروفیات کے علاوہ نیشنل ہیلتھ سروس میں مسلم امور کے ایڈوائزر ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے میزبانی کا حق ادا کردیا۔ان کی میزبانی کا سلسلہ لندن میں میرے ورود کے ساتھ شروع ہوا اور وہاں سے واپسی پر ہی ختم ہوا۔جب میں ۱۱ جولائی کی شام میں لندن پہنچا تو وہ اپنے بڑے بیٹے عزیزی بلال راشد اور چھوٹے بیٹے عزیزی صالح کے ساتھ ایرپورٹ پر موجود تھے۔ٹرین سے لندن سے کیمبرج کوئی سوا گھنٹے کا سفر ہے۔میں ٹرین سے وہاں جانا چاہتا تھا لیکن راشد صاحب اس کے لیے راضی نہیں ہوئے اور کار سے کیمبرج لے گئے اور قیام گاہ تک پہنچا کے واپس آئے۔اسی طرح ۱۴ جولائی کی شام میں سمینار ختم ہونے پر پھر کیمبرج آئے اور وہاں سے لندن اپنی قیام گاہ لے آئے۔اس سفر میں اور لندن میں قیام کے دوران جہاں کہیں کار سے جانا ہوا بلال ڈرائیونگ کی ذمہ داری بحسن وخوبی نبھاتے رہے۔میری

واپسی کے اگلے دن ہی ان کو ایک ورکشاپ میں یونان جانا تھا اور وہ اس کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے لیکن اس کے باوجود وہ کہیں بھی جانے کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اتنے مختصر وقت میں اتنی جگہوں تک رسائی ممکن ہو سکی۔ بلال بہت ہونہار اور سعادت مند طالب علم ہیں۔ ابتداء ہی سے اپنی محنت اور صلاحیت کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کی اسکالرشپ کے حق دار ٹھہرے۔ لندن کے بہترین اداروں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہاں تعلیم وتحقیق کے مشہور مرکز امپیریل کالج سے وابستہ ہوئے اور اس وقت وہیں سے فزکس میں پی-ایچ-ڈی کر رہے ہیں۔ دارالمصنّفین سے دلچسپی وراثت میں ملی ہے۔ مستقبل میں ان نوجوانوں سے بڑی توقعات ہیں۔

لندن میں میرے پرانے کرم فرما رضوان فلاحی صاحب کی موجودگی بڑی تقویت کی باعث تھی۔ رضوان صاحب ایک مدت سے لندن میں مقیم ہیں اور وہاں کے رابطہ عالم اسلامی سے وابستہ ہیں۔ دارالمصنّفین سے بڑا تعلق خاطر ہے اور اس کی بہبود کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ الفاروق کے انگریزی ترجمہ کی معیاری ایڈیٹنگ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ از راہ کرم ملنے کے لیے تشریف لائے، گھر پر پر تکلف کھانے سے تواضع کی اور رخصت کرنے کے لیے ایرپورٹ آئے۔ اگرچہ اس مختصر قیام کے دوران انفرادی ملاقاتوں کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں تھی لیکن مشہور اسلامی جریدے ''امپیکٹ انٹرنیشنل'' کے بانی مدیر حاشر فاروقی صاحب سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ اسلامی رسائل اور جرائد میں امپیکٹ کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ افسوس کہ یہ اب بند ہو چکا ہے۔ راشد صاحب کے ساتھ ان کے یہاں حاضری ہوئی۔ رضوان فلاحی صاحب بھی موجود تھے۔ گفتگو زیادہ تر دارالمصنّفین کے سلسلہ میں رہی۔ ان کو اس سلسلہ میں بہت فکرمند پایا۔ اپنے وسیع تجربات کی روشنی میں انہوں نے دارالمصنّفین کے حالات کی بہتری کے لیے کئی مفید مشورے دیے۔ انشاءاللہ آیندہ بھی ہم ان کے مشوروں اور تجاویز سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

کیمبرج دیکھ لینے کے بعد آکسفورڈ دیکھنے کی خواہش فطری تھی۔ دستیاب وقت میں صرف اتوار کو وہاں جانا ممکن تھا۔ یکسر محرومی سے بہتر یہی معلوم ہوا کہ کم از کم ان در و دیوار ہی کو دیکھ لیا جائے جہاں صدیوں سے علم ودانش کی شمع روشن ہے۔ چنانچہ اتوار کی صبح بلال اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں سلمان اور صالح کے ساتھ وہاں کے لیے روانہ ہوئے۔ گھوم پھر کے مختلف کالجوں اور بوڈلین لائبریری کو دیکھا۔ آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کو بھی باہر ہی سے دیکھا۔ کافی وقت کتابوں کی ایک دکان میں گذرا۔ صرف Trinity College کھلا ہوا تھا اور وہاں ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ ممکن تھا۔ اس طرح کم از کم ایک کالج کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں جس طرح ماضی کے آثار وروایات کو باقی رکھا گیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ مسلم ممالک میں صورت حال عموماً اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس آسانی سے ہم اپنے صدیوں پرانے آثار سے دست بردار ہو جاتے ہیں وہ عبرت ناک ہے۔

مقالات

علامہ شبلی کی سیرت النبی ﷺ میں وارد مستشرقین کا تعارف

جناب صاحب عالم اعظمی ندوی

موضوع اول: استشراق کی لغوی واصطلاحی تعریف نیز اس کے اسباب ومحرکات۔

لغوی تعریف: لفظ استشراق عربی زبان کے صیغہ ''استفعال'' کے وزن پر ہے، اور یہ لفظ ''شرق'' سے ماخوذ ہے، اس میں تین لفظوں کا مزید اضافہ کردیا گیا ہے وہ ہیں الف، سین اور تاء، جس کے جوڑنے سے اس لفظ کے معنی ''شرق کی طلب'' ہوجاتے ہیں، عربی لغت معجم الوسیط میں آیا ہے شرقت الشمس شرقا و شروقا اذا طلعت (۱) روشن ہونے کے معنی میں اور لسان العرب میں ہے شرق : شرقت الشمس تشرق شروقا و شرقا نکلنے کے معنی میں یا جانب مشرق اور جگہ کا نام مشرق اور التشریق جانب مشرق چلنا، کہا جاتا ہے۔

جہاں تک یورپی زبانوں کا تعلق ہے تو ان میں اس لفظ کی دوسری تعریف ملتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ شرق سے مقصود جغرافیائی مشرق نہیں بلکہ اس سے مراد روشنی اور نور و ہدایت ہے، لہذا بعض محققین کا کہنا ہے کہ لفظ استشراق صرف جغرافیائی مشرق سے ہی تعلق نہیں رکھتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ روشنی، ضیاء اور نور ہے جو لفظ غروب کے مخالف ہے جس کے معنی ختم ہونے کے ہیں (۲) اور یورپی تحقیقات میں مستعمل لفظ (Orient) سے مراد مشرقی علاقہ ہے نیز لفظ استشراق میں حرف سین طلب کے معنی دیتا ہے یعنی مشرق میں موجود ہر چیز کی تحقیق۔ (۳)

دار العلوم کالج قاہرہ، مصر۔

اصطلاحی تعریف: استشراق وہ تعبیر ہے جو مشرق کی جانب توجہ کرنے پر دلالت کرتی ہے اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو اہل مشرق کے واقعات اور تاریخ وتمدن کی چھان بین کرے، اس اصطلاح سے مراد وہ فکری رجحان ہے جو مشرقی ملکوں کے حوالے سے مختلف تحقیقی میدانوں میں کردار ادا کر رہا ہو، یہ مشرق کی تاریخ وتمدن، اس کے دینی افکار و مذاہب، زبانوں اور رسم و رواج سب پر محیط ہے، اس فکری رجحان نے اسلامی دنیا کے متعلق خصوصی طور پر اور مشرقی ملکوں کے تعلق سے عمومی طور پر مغربی نظریہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور شرق و غرب کے مابین قائم فکری کشمکش کو اجاگر کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔(۴)

استشراق کا میدان: اکثر محققین کا یہ خیال ہے کہ استشراق کی ابتداء عربی زبان وادب اور اسلام کے مطالعہ سے ہوئی، جس میں بعد میں خاص کر مشرقی ممالک میں یورپی استعمار کے بڑھنے کے بعد مشرقی ممالک کی تاریخ وتمدن، ان کے رسم و رواج اور ثقافت کی خصوصی تحقیقات سے وسعت آتی گئی اور آج تک دینی اور سیاسی عوامل کے پیش نظر مستشرقین انہیں میدانوں میں کام کر رہے ہیں۔(۵)

استشراق کے محرکات اور اس کے مقاصد: اسباب اور مقاصد کے لحاظ سے کوئی ایک عامل یا محرک نہیں ہے جس نے مستشرقین کو اسلامی تاریخ وتمدن کی تحقیق پر ابھارا، کیونکہ استشراق ایک بہت ہی پیچیدہ تاریخی مظہر ہے جس کے اسباب ومحرکات میں تاریخ کے دوران حسب ضرورت اس طور پر کمی بیشی آتی رہی کہ بعض محرکات کو بعض پر کسی متعین مرحلہ میں غلبہ حاصل رہا، لیکن ایک حقیقت ان میں مشترک رہی وہ یہ کہ سارے عوامل واسباب اور محرکات استشراق کے اثرات اور اس کے میدان کار کی تعین میں لگے رہے اور اب تک لگے ہوئے ہیں، ذیل میں استشراق کے کچھ خاص محرکات اور مقاصد بیان کیے جا رہے ہیں:

۱- دینی و دعوتی مقصد: استشراق کی نشو ونما میں یہ مقصد خاص اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ایک طویل مدت تک استشراق نے پورے زور وشور سے اسی میدان میں کام کیا، جس میں اسلام کے حوالے سے درج ذیل پروپیگنڈوں کا خاص خیال رکھا گیا:

اسلامی شریعت نیز رسالت نبویؐ کے متعلق شک وشبہ کو رواج دینا، یہ دعوی کرتے ہوئے

کہ احادیث شریفہ کا حضور ﷺ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ آپؐ کے بعد مسلمانوں نے ان حدیثوں کو وضع کیا ہے، مستشرقین کے اس پروپیگنڈہ کا اصل مقصد سنن شریفہ کی بے حرمتی نیز مسلمانوں کے نزدیک اس کی اہمیت کم کرنا ہے تاکہ ان کے اندر سے حضور ﷺ کی حیات طیبہ نیز اسلام کے احکام کو حقیقی تطبیق دینے کا ملکہ ختم ہوجائے اور اس طرح اسلام کی اصل قوت ہی ختم ہوکے رہ جائے۔(۶)

قرآن مجید کی صحت سے انکار نیز اس کے متعلق شک وشبہ کو رواج دینا اور اس پر اعتراضات کرنا، تاکہ مسلمان اس سے اجتناب برتیں کیونکہ یہی چیز ان کو باہم جمع کرنے والی اور ان کی قوت کا اصل سرچشمہ ہے نیز عرب معاشروں میں قومی عربی لہجوں کو فروغ دینا اور فصیح عربی زبان سے انہیں دور کرنا کہ یہ انہیں دین اسلام سے قریب تر کرنے والی چیز ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی فقہ کی قدر وقیمت اس پروپیگنڈے کے ذریعہ کم کرنا کہ وہ دراصل رومن فقہ کا چربہ ہے، نیز اسلامی اصول ومبادی کا اصل سرچشمہ یہودی اور مسیحی مذہبوں کو قرار دینا، اس کے علاوہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے نئے طریق کار اپنانا، اس طرح کے پروپیگنڈوں کو زیادہ ہوا اس وقت دی گئی جب یورپ نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے پے در پے شکست کھائی۔

۲- سیاسی اور استعماری مقصد: یورپی طاقتیں ایک طویل مدت تک مسلمانوں سے براہ راست جنگوں میں شکست کھاتی رہیں جس کا سلسلہ صلیبی جنگوں تک چلتا رہا اور ان صلیبی جنگوں کا بھی اصل مقصد مسیحیت کے علاوہ سارے مذاہب کو ختم کرنا تھا اور جس کا سب سے پہلا نشانہ اسلام تھا لیکن انہیں اس میں کامل کامیابی نہیں ملی، مگر وہ اپنی ان مسلسل ناکامیوں کے باوجود مایوس نہیں ہوئے اور پورے منصوبہ کے ساتھ ایک نئی فکری جنگ کا راستہ اختیار کیا، جس میں سرفہرست مذہب اسلام اور اس کی اس طویل تاریخ وتمدن کا خاص طور سے مطالعہ جو اسلامی زندگی کی رہنمائی میں گہری تاثیر رکھتی ہے اور جس کے ذریعہ رسم ورواج کو پھیلنے کا موقع ملتا ہے، اس وقت ان فکری سرگرمیوں کا اصل مقصد مشرق کی جانب بڑھتے ہوئے استعمار کی راہ ہموار کرنا تھا، جس نے حقیقت میں کافی کامیابی حاصل کی اور مستشرقین کی ان تحقیقاتی کوششوں کے نتیجہ میں استعماری قوتوں کو مشرقی ممالک پر سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی غلبہ حاصل ہوا، مشرقی ملکوں پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے بعد استعماری طاقتوں کو ان مغلوب قوموں کے اخلاق وعادات جاننے نیز ان کے ساتھ معاملہ

کرنے کے لیے مستشرقین نے علمی سرمایہ پیش کیا، مستشرقین کی اہمیت کے پیش نظر استعماری قوتوں نے انہیں ہر طرح کی علمی، تحقیقی سہولتیں مہیا کیں اور اس مقصد کے لیے جگہ جگہ تعلیمی و تحقیقی مراکز قائم کیے تاکہ یہ مستشرقین پوری لگن کے ساتھ مسلمانوں کے اسلامی ورثہ کی تحقیق کے نام پر استعمار کو قوت بہم پہنچاتے رہیں۔(۷)

تجارتی مقصد(۸): یہ مقصد دراصل سیاسی و استعماری نیز دینی مقاصد کا ایک اہم جزء تھا، کیونکہ یورپ میں تجارتی کمپنیاں اور سرکاری ادارے سیاح مستشرقین کو اسلامی ملکوں کے حالات جاننے کے لیے نیز ان ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی رپورٹ تیار کرنے کے لیے بے تحاشہ مال و دولت صرف کر کے مشرقی ممالک بھیجتے تھے۔ان کی اطلاعات سے اسلامی و عربی ممالک میں برسرکار کمپنیاں تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے نیز مقامی تجارت کے فروغ کو روکنے میں ان کو کافی سہولتیں حاصل رہیں، جس کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے انہیں سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ اقتصادی غلبہ بھی حاصل ہوگیا۔(۹)

خالص علمی مقصد: مذکورہ بالا مقاصد کے علاوہ مستشرقین کی ایک جماعت تاریخ میں ایسی بھی رہی ہے جس نے صحیح حقیقت تک پہنچنے کے لیے تحقیقی راستہ اختیار کیا، چونکہ نیت صحیح تھی لہذا اس جماعت کے لوگ نہ صرف حقیقت تک پہنچے بلکہ ان میں بعض مشرف بہ اسلام بھی ہوئے اور ان لوگوں کو اسلام سمجھنے میں دوسروں کے مقابلہ میں کم سے کم غلطیاں سرزد ہوئیں، کیونکہ ان کا مقصد زہر افشانی یا حقائق کی پردہ پوشی نہیں تھا، لہذا ان کے مطالعات اور تحقیقات دوسرے کئی مستشرقین کے مقابلہ میں حق سے قریب تر ہیں نیز یہ خالص علمی اصولوں پر وضع کیے گئے ہیں۔(۱۰)

موضوع دوم: ہندوستان میں استشراق کی تاریخ۔

ہندوستان میں استشراق کی بنیاد واسکوڈی گاما کے ہندوستان پہنچنے کے بعد پڑی لیکن اس کی نشو و نما خاص طور پر پندرہویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر پرتگالیوں کی تجارتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ہوئی(۱۱) اور مغلیہ حکومت کے قیام کے بعد اسے مزید پھیلنے کا موقع ملا، خاص طور پر اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ/۱۵۵۵-۱۶۰۵ء)، جہاں گیر (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ/۱۶۰۵-۱۶۲۷ء)، شاہجہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۹ھ/۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) اور اورنگ زیبؒ

(۱۰۶۹-۱۱۱۸ھ/۱۶۵۹-۱۷۰۷ء) کے زمانے میں پرتگالیوں کے علاوہ ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز بھی اس میدان میں آ گئے، جنھیں مسلم مغلیہ حکومت کی جانب سے ہندوستان میں تجارت جاری رکھنے کی پوری آزادی دی گئی اور حکومتی اہل کاروں اور اداروں نے ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا، خاص کر اورنگ زیب کے زمانے میں ان کے ساتھ تجارت کے پیش نظر خاص مراعات برتی گئیں اور ان کی متعدد دشمن نواز پالیسیوں اور جنگی اعمال کے باوجود ان کے ساتھ صلح و نیکی کا راستہ اپنایا گیا، جس کا اعتراف خود ان کے سیاح مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ (۱۲)

تجارت کے میدان میں اپنے پرتگالی اور ہالنڈی نیز فرانسیسی حریفوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد انگریزی تجارت کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سایہ میں ترقی کرنے کا موقع ملا، خاص طور پر اس کمپنی نے ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۸ء سے لے کر ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۹ء تک خوب مالی فوائد حاصل کیے، سلطنت مغلیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خطرات کا اندازہ ہی نہیں کرسکی کیونکہ سترہویں صدی میں مغلیہ حکومت قوت و طاقت میں اپنے بام عروج کو پہنچی ہوئی تھی، لہذا اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ انہیں تجارتی مراعات دے کر مستقبل کے ہندوستان کی باگ ڈور سونپ رہی ہے اور اس طرح انگریز خاموشی سے اپنے مشن میں لگے رہے اور اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھیں اور پھر اپنی خاص سیاسی چالوں اور مقامی حکمرانوں کی نااہلی اور غداری اور مسلمانوں کی آپسی کشمکش کے نتیجہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے آہستہ آہستہ ہندوستان کی زمام حکومت بھی سنبھال لی۔ (۱۳)

استشراق عہد استعمار میں: ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی باگ ڈور جہاں براہ راست برطانوی حکومت کے ہاتھ چلی گئی وہیں مسلمانوں کی باقی ماندہ امید بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی کیونکہ برطانوی سامراج نے پورے ہندوستان کو سیاسی اور ثقافتی نیز تمدنی جال میں پوری طرح بے بس کر کے رکھ دیا (۱۴)۔ ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے لیے ان کی تاریخ و تمدن رسم و رواج و ثقافت کو مکمل طور پر سمجھنے کی ضرورت آن پڑی (۱۵)، انگریزی حکومت نے ہندوستان اور مسلمانوں کے علمی ورثہ کی تحقیقات کرنے اور اس میں زہر افشانی کرنے اور اسلام اور اس کے نبی ﷺ اور مشاہیر اسلام کی صورت مسخ کرنے کے لیے مستشرقین کی ایک منظّم جماعت تیار کی (۱۶) اور تعاون کے لیے ہندوؤں سے بعض متعصب مورخین اور مفکرین

کی علمی خدمات کا بھی سہارا لیا (۱۷) اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے علمی مراکز بھی کھولے (۱۸) اور ان سب کا اصل مقصد سامراجیت کو استحکام اور عیسائیت کو فروغ دینا تھا۔ (۱۹)

مسلم علماء اور مفکرین نے بہت جلد انگریزی حکومت کی اس ناپاک سیاست کو بھانپ لیا اور آنے والے خطرہ کا پوری طرح احاطہ کر کے مستشرقین کا جواب دینے کے لیے کمر بستہ ہوئے، کچھ نے براہ راست عیسائی پادریوں سے مناظرے کیے (۲۰)، کچھ نے عیسائیت کے خلاف لٹریچر تیار کیا تو باقیوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں یورپی زبانوں میں عبور حاصل کرنے کے بعد ان ہی زبانوں میں مستشرقین کے جھوٹے اعتراضات کا جواب دیا (۲۱)، اس کے علاوہ یورپی طرز پر ہندوستانی علماء نے بھی ہندوستان میں علمی مراکز اور اکیڈمیاں کھولیں۔ (۲۲)

اس وقت کے دوسرے ہندوستانی علماء میں سرسید احمد خاںؒ کی شخصیت ایک مضبوط تن آور درخت کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کے سایہ میں کئی مایہ ناز شخصیتوں نے پرورش پائی اور سرسید کے تعلیمی اور اصلاحی کاموں سے بہت متاثر ہوئیں (۲۳)، سرسید احمد خاں نے جدید تعلیم حاصل کرنے کی مسلمانوں سے پرزور درخواست کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے ساری زندگی لگادی (۲۴) اور مدۃ العمر مستشرقین سے رفاقت رکھی لیکن جب مستشرق سر ولیم میور نے سیرت مصطفوی پر اپنی مشہور کتاب ''محمد کی زندگی'' (Life of Mohammed) تصنیف کی جس میں متعدد حقائق سے پردہ پوشی اختیار کرتے ہوئے نبی ﷺ اور اسلام کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کی تو سرسید برداشت نہ کر سکے اور اس کے رد کے لیے پورے جی جان سے لگ گئے (۲۵)، نہ صرف یہ بلکہ اپنی کتاب کا مواد فراہم کرنے کے لیے لندن کا ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں سفر کیا اور اس کے لیے ذاتی قیمتی چیزیں بھی فروخت کر دیں اور پھر ''خطبات احمدیہ'' تصنیف کی، جو ان کی کتابوں میں سب سے اچھی تصنیف ہے، بعض علماء کے خیال میں عالم اسلام میں مستشرقین کے جھوٹے الزامات و اعتراضات کا جواب دینے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ (۲۶)

علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۲۷۴-۱۳۳۳ھ/۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کا شمار ہندوستان کے ان جید علماء میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں استشراق کے مقاصد کو پہلی فرصت میں بھانپا اور اسلام و نبی ﷺ کے متعلق مستشرقین کے تعصب اور حسد کی سنگینی کی جانب توجہ کی،

انہوں نے مستشرقین کی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کیا اکثر مستشرقین ان کے ہم عصر تھے جن کی تصنیفات یورپ سے ہندوستان پہنچیں ۔ اکثر کی طباعت بھی ہندوستان میں ہوئی ۔ علامہ نے سیرت النبی کی پہلی جلد کے مقدمہ میں مستشرقین کے حوالے سے جوفہرست دی ہے اس میں ۳۷ مستشرقین ، ان کی قومیت ، ان کی تصنیفات کے نام اور سن طباعت کا ذکر کیا ہے ، جن میں ۷ کتابوں کو چھوڑ کر جو ۱۹۱۰ء تک منظر عام پر آئیں ، باقی سب انیسویں صدی میں لکھی گئیں ، خاص طور پر ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تصنیفات زیادہ ہیں ان کتابوں کو پورے یورپ اور عالم اسلام میں منصوبہ بند طریقے سے عام کیا گیا ۔۔

چونکہ ان تصنیفات کی نشر واشاعت کا مقصد واضح تھا ، لہٰذا علامہ شبلی نعمانیؒ ان کا جواب دینے کے لیے ایک طاقتور محاذ قائم کرنے میں کامیاب رہے اور ان مستشرقین کی چال سے ان کو مات دی اور مشاہیر اسلام کا سلسلہ وار تصنیفی کام کا بیڑا اٹھایا کہ ان مستشرقین کے کذب وافتراء اور بے بنیاد دعووں کو جھوٹا ثابت کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی تھا (۲۷) ، سب سے پہلے انہوں نے عباسی خلیفہ مامون الرشید کی سیرت پر ایک مایہ ناز کتاب ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء میں تصنیف کی ، پھر شیخ حضرت ابوحنیفہؒ کی سیرت پر ''سیرت النعمان'' کے عنوان سے ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۱ء میں شائع کی ، جب حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت پر لکھنا شروع کیا تو اس وقت ان کی شرق اوسط اور ترکی کے سفر سے واپسی ہوچکی تھی اور اس کتاب کے حوالے سے جو علمی مواد مطلوب تھے ، وہ انہوں نے اس علمی سفر میں حاصل کر لیے تھے (۲۸) ، لہٰذا ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء میں ''الفاروق'' کے نام سے یہ معرکۃ الآراء کتاب تدوین کی ، پھر ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء میں امام غزالیؒ کی سیرت پر ''الغزالی'' لکھی ، ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء میں اپنے دور کے سب سے بڑے صوفی مولانا روم کی حیات پر ''سوانح مولانا روم'' کے نام سے ایک بہترین کتاب تدوین کی ، اس وقت ہندوستان میں اسلامی عہد کے سلاطین وملوک پر مستشرقین اور بعض متعصب ہندوؤں نے سلسلہ وار کتابیں لکھیں ۔ اورنگ زیب عالم گیر کے متعلق ان لوگوں نے کافی غلط بیانی کی اور غلط فہمی پھیلائی ، ان سب کی مورخانہ تحقیق وتنقید اور اصلی واقعات کی تفصیل کے لیے علامہ نے ''مضامین عالم گیری'' کے نام سے ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں کتاب لکھی ۔

علامہ نے جب سیرت النبی لکھنے کا ارادہ کیا تو موضوع کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر اپنے تردد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرت نبوی کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے کرنے کی جرات نہ کرسکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورت بڑھتی جاتی، یورپ کے مورخین آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کردیا ہے، اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو ان ہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی ۔ یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا، یہ کام بظاہر آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی'' ۔(۲۹)

بہرحال علامہ نے انہیں اسباب کے پیش نظر سیرت النبی تصنیف کرنا شروع کی، پہلی جلد ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آئی، اس جلد میں علامہ نے ایک نہایت ہی جامع اور مبسوط مقدمہ باندھا اور مستشرقین کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی اور ان کو تین قسموں میں تقسیم کیا:

۱- وہ لوگ جو عربی زبان نہیں جانتے لہٰذا اصل ماخذوں سے رجوع نہیں کرسکتے، اس لیے ان لوگوں کی معلومات کا اصل ذریعہ اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور غیر کامل مواد کا قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

۲- اس زمرے کے لوگ عربی زبان و ادب، تاریخ و فلسفہ اسلام کے ماہرین میں

شمار کیے جاتے ہیں لیکن اصول دین اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا اصول دین پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام اور شارعؑ اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔

۳- اس زمرے میں وہ مستشرقین آتے ہیں جنہوں نے خاص اسلامی اور اصول دین کا کافی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ان لوگوں سے کچھ خیر کی امید ہو سکتی تھی لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے یہ لوگ اپنی دینی اور سیاسی عصبیت کی وجہ سے کبھی بھی منصف نہیں رہے۔(۳۰)

موضوع سوم: مستشرقین کا تعارف۔

علامہ شبلی نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں مستشرقین کے اعتراضات کا مدلل جواب دینے کے لیے ایک بہترین اصول وضع کیا ہے اور غالباً یہ اصول وضع کرنے کی انہیں ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اسلامیات اور مشاہیر اسلام کی سیرت کے حوالے سے سارے متعصب اور غیر منصف مستشرقین کے اعتراضات تقریباً ایک جیسے ہی ہیں، ان میں سے ایک اگر کوئی غلط اعتراض کرتا ہے تو اس کا لاحق اس میں مزید ایک دو جھوٹ ملا دیتا ہے، اس طرح ان کے جھوٹ اور دروغ گوئیوں کا جواب دینے والا مسلسل دروغ بیانی کے ہجوم میں طیش میں آ کر مدلل جواب دینے سے قاصر ہو جاتا ہے(۳۱)۔ یہ عین ممکن ہے کہ جب علامہ نے سیرت کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات پر نظر کی ہوگی تو اپنے آپ کو جھوٹ و افتراء کے جنگل میں پایا ہوگا، لہٰذا اگر ہر ایک کے انفرادی اعتراضات پر علاحدہ علاحدہ جواب دینے کی کوشش کرتے تو یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوتا، اس لیے بجائے اس کے انھوں نے ان کی دروغ گوئیوں کے اصول و ضوابط بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو تقسیم کر دیا اور پھر اسلامی تحقیقات کے حوالے سے ان کے مشترک اصولوں کو یکجا کر کے بیان کر دیا اور اس وقت تک جتنی بھی اہم کتابیں مستشرقین نے سیرت نبوی اور اسلامی تحقیقات کے حوالے سے مدون کی تھیں سب کو ایک فہرست میں سمیٹ دیا اور اس کے بعد اہم اور مشہور مستشرقین کے اہم اعتراضات کا جگہ جگہ جواب دیا۔ آیندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ ان کی فہرست میں مذکور سبھی مستشرقین کے سارے اعتراضات کا سیرت النبیؐ کی

ساتوں جلدوں میں اپنی اپنی جگہ پر مدلل جواب دیا گیا ہے۔کوشش کی جائے گی کہ علامہ نے جس مستشرق کی جس کتاب کا نام دیا ہے اس کے مضامین کا مختصر تعارف بھی آجائے جس سے مزید معلومات میں اضافہ ہو۔ اس مختصر مقدمہ کے بعد سیرت النبیؐ میں مذکور فہرست کی روشنی میں مستشرقین کا تعارف درج ذیل ہے:

۱- وایٹ، جوزیف (۱۱۵۸-۱۲۲۸ھ/۱۷۴۶-۱۸۱۴ء) White, J (قومیت انگلستان):
آکسفورڈ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں عربی وعبرانی زبان کے استاذ کے طور پر تقرری ہوئی، ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں بطور عیسائی کاہن کے خدمات انجام دیں، پھر آکسفورڈ ہی میں سب سے بڑے چرچ کی ذمہ داری اسے سونپی گئی۔

علمی یادگار: اسلام اور عیسائیت کے تقابلی مطالعہ میں سلسلہ وار لکچر دیئے اور ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء میں بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام کے نام سے کتاب شائع کی، اس کے علاوہ ''تزوکات تیمور'' بھی شائع کی۔ (۳۲)

۲- ڈی ٹاسی، گارسن (۱۲۰۸-۱۲۹۴ھ/۱۷۹۴-۱۸۷۸ء) Tassy,Gracin, de (قومیت: فرانس): مشہور مستشرق ڈی ٹاسی سے عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایشیاٹک میگزین کی ادارت سنبھالی اور اس میں متعدد گراں قدر مقالات شائع کیے۔

علمی یادگار: اسلامی تحقیقات اور تاریخ میں اس مستشرق نے کافی طبع آزمائی کی ہے، ابن غانم المقدسی کی کتاب ''کشف الاسرار عن حکم الطیور والازہار'' (۱۸۲۱ء) کے علاوہ عزالدین المقدسی کی کتاب ''الامثال الادبیہ'' کا ترجمہ کرکے اسے پیرس سے (۱۸۲۱ء) میں شائع کیا لیکن اس کی سب سے اہم تصنیف ''اسلام اور قرآن'' (L'Islamisme D'apres de Coran, L'enseignement doctrinal et la pratique) ہے، اس کتاب میں ایک مختصر مقدمہ نیز حضورؐ کی شخصیت اور آپ کی بعثت کے متعلق آیات قرآنیہ کے ذکر کرنے کے بعد چوبیس فصلوں میں ''دین اسلام کی تعلیمات اور احکام'' پر تفصیلی بحث کی ہے، سب سے پہلے یہ کتاب کلکتہ سے ۱۸۲۲ء میں شائع ہوئی۔ (۳۳)

۳- ڈاکٹر جوستاف ویل (۱۲۲۲-۱۳۰۶ھ/۱۸۰۸-۱۸۸۹ء) Dr.Gustva Weil (قومیت

جرمنی): مشرقی زبانوں کے استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، الف لیلہ ولیلہ کا جرمنی زبان میں ترجمہ بھی کیا، پھر اپنے آپ کو اسلامی تاریخ کے مطالعہ وتحقیق کے لیے وقف کردیا، ۱۸۴۳ء میں سیرت طیبہ پر ایک مبسوط کتاب جرمنی زبان میں لکھی، ۱۸۴۴ء میں ''مقدمہ تاریخیہ نقدیہ فی القرآن''، لکھی، تین جلدوں میں تاریخ خلفاء ۱۸۴۴-۱۸۵۱ء میں تصنیف کی، ۱۸۶۰ سے ۱۸۶۲ء کی مدت میں ''مصر میں عباسی خلفاء کی تاریخ'' مدون کی۔ اس کی تصنیف ''محمدؐ النبی: آپ کی سیرت اور تعلیم'' کے حوالے سے مستشرق جوستاف بفانمولّلر کا قول نقل کرنا بہتر ہوگا، وہ لکھتا ہے ''۱۸۴۳ء سے سیرت نبوی کی بحث وتحقیق کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، کیوں کہ اس سال پہلی مرتبہ محمدؐ کی سیرت سے متعلق ایک ناقدانہ تاریخی مطالعہ منظر عام پر آیا، اس سے پہلے اس حوالے سے جتنی بھی کوششیں ہوئیں سب تقلیدی تھیں اور کسی نے بھی اپنی تصنیف میں تنقیدی پہلو پر بہت زور نہیں دیا تھا، بلکہ سو سال پہلے کی تصنیفات ہی ان کا نمونہ رہی تھیں۔ جہاں تک ڈاکٹر ویل کا تعلق ہے تو وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے درج ذیل کوششیں کیں:

اول: عرب سیرت نگاروں نے اسلام کے بانی کے متعلق جو کچھ لکھا اس کا انہوں نے تنقیدی مطالعہ کیا اور اخیر زمانہ میں آپ کی سیرت سے چسپاں افسانوں سے موثوق تاریخی واقعات الگ کر کے بیان کیے۔

دوم: انہوں نے اپنے آپ کو مذہبی تاثیر سے الگ رکھتے ہوئے محمدؐ کی شخصیت کو بطور انسان و نبی وشارع تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوم: اور آخر میں قرآن کو جو مختلف قسم کے ترانوں، نمازوں، قصے کہانیوں، عقائد، مواعظ، دستور وقوانین کا مرقع ہے، سے مبرا کرکے زمانے کے اعتبار سے اسے ترتیب دیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی تصنیف سے پہلے ڈاکٹر ویل نے مشرق ومغرب دونوں جگہوں سے سیرت پر ہوئے کام کو اکٹھا کیا، نیز اس کام کے لیے اسفار بھی کیے۔ اور اس سے متعلق سارے قدیم ماخذ جمع کیے اور پھر ان کا تنقیدی مطالعہ کیا، پھر آخر میں ایک مورخ کی حیثیت سے ان ماخذوں کو چھان پھٹک کر ایک نادر تحفہ پیش کیا اور اس طرح محمدؐ کی سیرت پر پہلی ناقدانہ تحقیق ہم تک پہنچی۔ (۳۴)

۴- کارلائل، توماس (۱۲۰۹-۱۲۹۷ھ/۱۷۹۵-۱۸۸۱ء) Carlyle, Thomas (قومیت:

انگلستان): اس کا شمار بڑے انگریز مورخوں اور فلسفیوں میں ہوتا ہے، اسلامی تحقیقات کے حوالے سے اس کا شمار منصف مستشرقین میں ہوتا ہے، جس نے بہت ہی ایمان داری کے ساتھ سیرت طیبہ کا مطالعہ کر کے اصل حقائق انگریزی معاشرہ میں پیش کیے، ۱۸۴۰ء میں اس نے اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (On Heroes and Hero Worship and the heroic in History) کتاب شائع کی جس میں دوسرے لکچر کو نبیؐ کی سیرت نگاری کے لیے خاص کیا ہے۔(۳۵)

۵- کوسن ڈی برسیوال، ارمان (۱۲۰۹ - ۱۲۸۷ھ/۱۷۹۵ - ۱۸۷۱ء) Caussin de Perceval, A.P. (قومیت فرانس): یہ مشہور مستشرق جون جاک کوسن ڈی برسیوال کا بیٹا ہے(۳۶) اپنے والد سے وراثت میں علمی ذخیرہ اور شہرت حاصل کی، نیز مشرقی زبانوں کے سیکھنے میں اس کے والد کی شخصیت بہت موثر رہی، ۱۸۱۷ء میں ٹرکی کا سفر کیا اور وہاں سے آ کر لبنان میں تین سال سکونت پذیر رہا، پیرس واپسی پر مشرقی زبانوں کے مدرسہ میں بطور مدرس کام کیا، پھر ۱۸۳۳ء میں معہد فرانس میں عربی کے استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، ۱۸۴۹ء میں مجمع لغوی کی رکنیت بھی حاصل کی۔

علمی یادگار: عامی زبان کے صرفی ونحوی قواعد، ابن المغازی والحکم کا فرانسیسی میں ترجمہ، عرب موسیقی نگاروں کی سوانح، پھر الیاس کی فرانسیسی عربی لغت کی تحقیق کا کام بھی سرانجام دیا، اسی طرح ایشیا ٹک میگزین میں سیرت طیبہ، نیز اسلام سے پہلے عربی تقویم جیسے سلسلہ وار مقالات بھی شائع کیے لیکن اس کی مایہ ناز کتاب ''تاریخ عرب'' ہے جو ۱۸۴۷ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی اور فوراً ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ اس کتاب کے لگا تار چار ایڈیشن شائع ہوئے، اس میں اس نے قدیم عربی کی کتابوں سے معلومات جمع کیے ہیں، عرب کی تاریخ تین حصوں میں تقسیم کی، اسلام سے پہلے، عہد بعثت میں، اسلام کے سایہ میں قبائل کا جمع ہونا، اور اسلامی تمدن کا پھیلنا۔(۳۷)

۶- ارونگ، واشنگٹن Irving. W. (قومیت امریکا): علامہ نے اس مستشرق کی قومیت انگلستان لکھی ہے جب کہ یہ امریکی نژاد ہے۔

علمی یادگار: اس کی کتاب ''سیرت محمدؐ'' سب سے پہلے ۱۸۴۹ء میں نیویارک سے شائع

ہوئی، ۱۸۵۱ء میں اس کا جرمنی زبان میں ترجمہ ہوا، پھر ہسپانوی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ۱۹۶۴ء میں ہوا، اس کے دوسرے تاریخی نگارشات میں ''تاریخ فتح غرناطہ'' اور ''محمدؐ اور ان کے اصحاب Mahomet and his Successors'' جو ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی، قابل ذکر کتابیں ہیں۔(۳۸)

۷-اسپرنگر، الویس (۱۲۲۷-۱۳۱۰ھ/۱۸۱۳-۱۸۹۳ء) Sprenger, Aloys (قومیت جرمنی): جرمنی نژاد ۱۹۳۸ء میں انگلستان کی قومیت بھی حاصل کی، کافی دنوں تک ہندوستان میں کام کیا، پھر سوئزرلینڈ کی یونیورسٹی ''برن'' میں مشرقی زبانوں کے استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

علمی یادگار: خلفاء کے عہد میں عربی طب کے اصول، تین جلدوں میں، سیرت محمدؐ۔ پہلی جلد الٰہ آباد سے ۱۸۵۱ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی، پھر تینوں جلدیں جرمنی زبان میں برلن سے ۱۸۶۱-۱۸۶۵ء میں شائع ہوئیں۔ (باقی)

حوالے

(۱) المعجم الوسیط، جلد ط: مجمع اللغہ العربیہ القاہرہ، ص ۴۸۳/محمد فرید وجدی: دائرہ معارف القرن العشرین، جلد ۵، ص ۳۷۹۔ (۲) السید محمد الشاہد: الاستشراق ومنہج النقد عند المسلمین المعاصرین، ط: ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۱-۲۱۱۔ (۳) حسن ضیاء الدین عتر: الاستشراق نشأتہ واہدافہ، ص ۲۶، ط: مجلّہ کلیہ الشریعہ مکہ مکرمہ، ۱۴۰۰/۱۴۰۱ھ۔ (۴) استشراق کے حوالے سے مزید معلومات کے لیے درج ذیل کتابیں دیکھیں: فاروق عمر فوزی، الاستشراق والتاریخ الاسلامی (القرون الاسلامیۃ الاولی) دراسۃ مقارنۃ بین وجہۃ النظر الاسلامیۃ ووجہۃ النظر الاوروبیۃ، ط: مکتبۃ الاہلیۃ للنشر والتوزیع، عمان، الاردن ۱۹۹۸ء، ص ۲۵-۳۰/محمود حمدی زقزوق: الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ط: دار المعارف القاہرہ ۱۹۹۷ء، ص ۱۸/الدکتور رسامیلوفتش: فلسفۃ الاستشراق واثرہا فی الادب العربی المعاصر، ط: دار المعارف القاہرہ ۱۹۸۰ء، ص ۳۴/ (Edward said: Orientalism, Routledge and kegon Paul, P. London 1978, Pp,1-6۔

(۵) مصطفیٰ السباعی: الاستشراق والمستشرقون ما لہم وما علیہم، ط: المکتب الاسلامی، بیروت عام ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء،

ص ۱۵۔(۶) بعض اسکالرز کا کہنا ہے کہ:''یورپی معاشرہ ایک طویل مدت تک اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا اور جب جاننے کی کوشش کی تو یورپ کے دینی ٹھیکہ داروں نے سب سے پہلے اسلام کے خلاف ہوا کھڑا کرنا شروع کیا اور اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے اسلام اور نبی ﷺ کے حوالے سے پورے یورپی معاشرہ میں دروغ بیانیوں اور تدلیسات کو پھیلایا، اس دعوے کے ساتھ کہ اسلام ایک خبیث اور خطرناک قوت ہے اور یہ کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) ایک بت ہیں جن کی ان کے ماننے والے پرستش کرتے ہیں ان خرافات نے لاطینی علماء کے دماغ میں اس طرح جگہ لی کہ یہ ان کی کتابوں میں نظر آنے لگیں، مقصد صرف اور صرف اسلام کی غلط صورت پیش کرنا تھا تا کہ یورپی معاشرے کو اسلام سے خوف زدہ کر کے اس سے دور رکھا جائے اور اس کو بدترین شکل میں پیش کیا جائے، محمود حمدی زقزوق: الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ص ۲۱-۲۲/ نیز انور الجندی: مقالۃ، المستشرقون والاسلام، نشر فی کتاب الاسلام والمستشرقون، ط: دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، شبلی النعمانی، اعظم گڑھ، الہند عام ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۰/ یورپی پادریوں اور علماء کی ان غلط کارستانیوں کا اعتراف ان ہی کے بعض اہل علم نے بھی کیا ہے، جس کی ایک مثال سیرت النبیؐ کی جلد اول کے مقدمہ میں ''مستشرق ہنری دی کاستر و'' کے حوالے سے دی گئی ہے، جلد ا، ص ۶۴-۶۵۔(۷) مصطفیٰ السباعی، مرجع سابق، ص ۱۷-۱۸/ ایضاً فاروق عمر فوزی: الاستشراق والتاریخ الاسلامی، ص ۳۴/ عبد القہار عبد الواحد: الاستشراق والدراسات الاسلامیۃ، ط: دار الفرقان، عمان، ۲۰۰۰ء، ص ۲۹/ اور شاید اسی لیے بعض محققین کا یہ کہنا ہے کہ مستشرقین نے اسلامی علوم میں جو علمی خدمات پیش کی ہیں اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، انہوں نے جو بھی علمی کام کیے ہیں خواہ وہ اسلامی کتابوں کی تحقیق و اشاعت کا معاملہ ہو یا احادیث کی کتابوں کے الفاظ کی فہرست سازی ہو، ان کے پیش نظر کبھی بھی یہ مقصد نہیں رہا کہ ہم مسلمان بھی ان سے مستفید ہوں اور اگر ضمنی طور پر ہمیں ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا بھی تو یہ ان کی خواہش اور رغبت سے نہیں بلکہ ان کی مجبوری کے تحت ہوا، دیکھیں: عبد العظیم الدیب: مقالۃ المستشرقون والتاریخ، نشر فی کتاب الاسلام والمستشرقون، ص ۱۳۵-۱۳۶۔ (۸) تجارتی مقاصد کی تفصیلات کے لیے دیکھیں: علی بن ابراہیم الحمد النملۃ الاستشراق والدراسات الاسلامیۃ، ط: مکتبۃ التوبۃ، الریاض، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء۔ (۹) مثال کے طور پر مستشرق سیاح قوردن لوریمر (J.G. Lorimer) جسے ہندوستانی انگریز حکومت نے خلیج عربی کے حوالے سے ایک تاریخی انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے پر مکلّف کیا اور اس کے لیے حکومت نے اس کا پوری طرح تعاون کیا، اس مستشرق نے اپنی ماتحتی میں کچھ ہی

سالوں میں چھ ضخیم جلدوں میں (Gazetteer of the Persian Gulf, Oman and Central Arabia) تیار کر کے حکومت کے سپرد کیا، ہندوستان سے متعلق اس طرح کی سب سے ضخیم انسائیکلو پیڈیا (The Imperial Gazetteer of India) ہے جو مستشرق ولیم ولسن ہنٹر کی نگرانی میں ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں تیار کیا گیا، یہ انسائیکلو پیڈیا ۲۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد ہندوستان کے جغرافیائی، سیاسی اور تمدنی موضوعات پر مشتمل ہے، مزید معلومات کے لیے دیکھیں: (The Imperial Gazetteer of India: 20 Vol. Pub. Oxford 1909)۔ (۱۰) یہاں یہ اشارہ کرنا بہتر ہوگا کہ ان منصف مزاج مستشرقین میں سے کچھ کی ثقافتی تربیت علمائے اسلام کے زیر سایہ براہ راست یا بالواسطہ رہی جس کی وجہ سے ان کی تصنیفات میں عصبیت کی جگہ انصاف نظر آتا ہے، ان میں سرفہرست ہم توماس آرنلڈ اور کارلائل کے نام ہیں، آرنلڈ کا قول ہے کہ میں تہِ دل سے اپنے دوست اور رفیق عالم شمس العلماء مولوی محمد شبلی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے اسلامی تاریخ کے تئیں مجھے معلومات بہم پہنچانے میں پوری سخاوت کا مظاہرہ کیا''، دیکھیں عربی ترجمہ: توماس آرنلڈ، الدعوۃ الی الاسلام، ترجمہ حسن ابراہیم حسن وآخرین، ص ۸ ط: مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ۱۹۴۷ء، کارلائل کی ملاقات سرسیدؒ سے لندن میں رہی، یہاں یہ ذکر کرنا بھی بہتر ہوگا کہ منصف مزاج مستشرقین کی تصنیفات کا نہ صرف ہمارے علماء نے عربی اور اردو زبانوں میں ترجمہ کیا بلکہ اپنی تصنیفات میں اسلام کے خلاف وضع کیے ہوئے افتراء وکذب کے خلاف اپنی بات کی تاکید کے لیے جگہ جگہ ان کا حوالہ بھی دیا۔ (۱۱) پرتگالی مستشرقین کی تجارتی اور دینی سرگرمیوں کی تفصیل کے لیے دیکھیں: زین العابدین المعبری: تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتغالیین، حققہ وقدم لہ وعلق علیہ امین توفیق الطیبی، ط: کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، طرابلس ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۸م، ص ۱۸، For more information about them see Frederick Charles Danvers: The Protuguees in India Being a History of the Rise and Decline of the Eastern Empire,(Vol.2) London 1894 , Vol.2۔ (۱۲) دیکھیے الگزنڈر ہاملٹن (ت ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۳م) کی مایہ ناز کتاب (A New Account of the East Indies)۔ (۱۳) انہیں منزل مقصود تک پہنچانے میں سیاح مستشرقین کی تصنیفات نے اہم کردار ادا کیا، کچھ اہم مستشرقین کے نام اور ان کی تصنیفات کا ذکر فائدہ مند ہوگا: عہد اکبری 1- Francisco de Sousa: Orientse conquistador a jesu christo pelos. 2- padres da companhia de jesus da

provincia de Goa. 3- Francis Goldie: The First Christian Mission to the Great Mogul. 4- Ralph Fitch: Fitch, England's Pioneer to India, Burma.

جہاں گیری عہد: 1- Edward Terry: A Voyage to East India. 2- Thoms Roe: The Embassy of Sir Thomas Roe to the Court of the Great Mogul 1615-1619. 3- John de Laet: De Impeio Magni Mogolis, Sive India Vera Commentarius e Variss auctoribus congestus.

شاہ جہانی و عالم گیری عہد : 1- captain Alexander Hamilton (1688-1733): A new Account of the East Indies,(2Vol) London, 1739. 2- Francois Bernier (1625-1688): Travels in the Mogul Empire: Tr. Archibald Constable, London 1891. 3- Niccolao Manucci (1653-1708): Storia Do Mogor or Mogul India Trans: William Irvine. 3Vol. P. Calcutta, India 1965۔

(۱۴) ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کریں: عطاء الرحمٰن قاسمی ، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ ، ط : ادارہ شاہ ولی اللہ ، دہلی ۲۰۰۸ء۔ (۱۵) For more information see leslie Mcloughlin: In a sea of Knowledge: British Arabists in the Twentieth Century (Reading: Ithaca Press, 2002) Pp. 298۔ (۱۶) اس ضمن میں دہلی کالج کی بنیاد ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء اور ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتا یونیورسٹی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء، بمبئ یونیورسٹی ۱۲۸۵/۱۸۶۹ء، الہ آباد یونیورسٹی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء وغیرہ بڑے علمی مراکز قائم کیے گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: نجیب العقیقی ، المستشرقون، ۳ مجلد ط۵: دار المعارف قاہرہ ۲۰۰۶م، ج۲،ص ۱۶- ۲۱۔ (۱۷) اس طبقے میں سرفہرست نام سرجدوناتھ سرکار (۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) کا لیا جاسکتا ہے جنھوں نے انگریز استعمار کو خوش کرنے اور اسلام اور اسلامی شخصیات کو مجروح کرنے کے لیے تاریخ سازی کی۔ سرفہرست کتاب ''تاریخ اورنگ زیب'' ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ (۱۸) عہد استعمار کے ہندوستان میں استعمار کے لیے کام کرنے والے مستشرقین کی ایک لمبی فہرست ہے ، ان میں سب سے مشہور شخصیت ولیم جونز (Jones, Sir William): ۱۱۵۸-۱۲۰۸ھ/۱۷۴۶-۱۷۹۴ء ہے جو اپنے وقت میں یورپ اور ہندوستان کے مستشرقین کا امام سمجھا جاتا تھا، اسی نے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اس سوسائٹی میں

کافی عرصہ انگریز مستشرقین ہی کو ممبر شپ حاصل کرنے کی اجازت حاصل تھی، تفصیل کے لیے دیکھیں: العقیقی: المستشرقون، ج ۲، ص ۴۷-۴۸، اسی طرح لمسدن، م (Lumsden, M.) ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء ہے، اس کا شمار ان مستشرقین میں ہوتا ہے جنہوں نے ہندوستان میں استشراق کو منظم کیا، عربی فارسی تصنیفات کے علاوہ ان زبانوں کی اہم کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور کروایا، تفصیل کے لیے دیکھیں: العقیقی: محولہ، ج ۲، ص ۵۰-۵۱/مورلی، اسی طرح ولیم ہوک (۱۲۲۹-۱۲۷۶ھ/۱۸۱۵-۱۸۶۰ء) Morley, W.H. نے عرصے تک کلکتا میں جسٹس کے فرائض انجام دیئے، ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر کے طور پر مخطوطات کی فہرست مکمل کی نیز اسلامی اور ہندو شریعت کے نام سے کتاب بھی تدوین کی، دیکھیں محولہ، ج ۲، ص ۵۷-۵۸۔ (۱۹) اس وقت کے مستشرقین نے یورپ میں بھی اور برصغیر میں بھی سیرت نگاری اور تاریخ سازی کا ایک نیا اسلوب اپنایا اور وہ یہ کہ حضور ﷺ اور مشاہیر اسلام کے حوالے سے سارے چھوٹے بڑے واقعات کا احاطہ کر کے ان پر اعتراضات شروع کیے، اس سلسلے میں ایلیٹ وڈاؤسن نے تاریخ ہندوستان آٹھ جلدوں میں مکمل کی جو دراصل عہد اسلامی میں لکھی گئی فارسی تاریخوں کے چیدہ چیدہ ابواب کے ترجمے پر مشتمل ہے، دیکھیں H.M. Elliot & John Dowson: The History of India, as Told by Its Own Historians,. The Muhammadan Period۔ (۲۰) اس زمرے میں علامہ رحمت اللہ (۱۸۱۸-۱۸۹۱ء) کا نام سب سے نمایاں ہے، جنہوں نے پادری فنڈر (C.G. Pfander) سے تاریخی مناظرہ کیا۔ آل حسن موہانی (۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء) نے بھی استفسار اور استبشار جیسی مایہ ناز کتابیں لکھ کر عیسائی مشنریوں کا مدلل جواب دیا، تفصیل کے دیکھیں ابوالحسن الندوی، مقالۃ الاسلام والمستشرقون، نشر فی کتاب، الاسلام والمستشرقون، ص ۱۶، ۱۷، ۱۸، رحمت اللہ صاحب کی سوانح کے لیے ان کی کتاب پر ابوالحسن الندوی کا مقدمہ ملاحظہ کریں، اظہار الحق، ط: قطر ۱۹۸۱ء۔ (۲۱) ان میں سے سرفہرست مولوی چراغ علی (ت ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء) ہیں جنہوں نے اسلامی جہاد کے حوالے سے مستشرقین کا جواب دینے کے لیے (Critical Exposition of popular Jihad)، نیز سیرت طیبہ پر Mohammed the Prophet تصنیف کی، سید امیر علی (۱۲۶۵-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۹-۱۹۲۸ء) بھی ہیں جنہوں نے سیر و تاریخ میں کئی کتابیں لکھیں، انہوں نے ۲۴ سال کی عمر میں سیرت طیبہ پر (A Critical Examination of the Life and Teachings of Mohammed) تصنیف کی، صلاح الدین خدابخش (۱۲۹۳-۱۳۴۹ھ/۱۸۷۷-۱۹۳۱ء) نے معروف مستشرق آدم متز کی کتاب ''چوتھی

صدی ہجری میں اسلامی تمدن'' کا جرمنی زبان سے انگریزی زبان میں (Islamic Civilization in the Fourth Century of the Hegira) کے عنوان سے ترجمہ کیا اور اسلامی تمدن پر ایک مایہ ناز کتاب (Contribution to the History of Islamic Civilization) کے نام سے لکھی، علامہ محمد اقبال (۱۲۹۳-۱۳۵۶ھ/۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) نے اپنے کلام سے اسلام اور مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور مایہ ناز کتاب (Reconstruction of Religious Thought in Islam) تصنیف کی، جس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے ایک مصری عالم عباس محمود نے اسے (تجدید الفکر الدینی فی الاسلام) کے عنوان سے شائع کیا۔(۲۲) عالم اسلام کی سطح پر سب سے پہلے علامہ شبلیؒ نعمانی نے یہ کوشش شروع کی، خواب ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندویؒ نے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں ان کے تخیل کو دارالمصنّفین کی شکل دی۔ دائرہ معارف حیدرآباد بھی ہے جو اگرچہ دارالمصنّفین سے بہت پہلے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں قائم کیا گیا لیکن اس کا قیام خالص مستشرقین کے رد کے پیش نظر نہیں تھا، ندوۃ المصنّفین ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء میں دہلی میں قائم کیا گیا، ان سارے علمی مرکزوں نے تالیف وتصنیف میں مایہ ناز خدمات انجام دیں۔(۲۳) سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی کوششوں سے پوری ایک نسل متاثر ہوئی اور ہندوستان کی مایہ ناز شخصیتوں نے براہ راست یا بلا واسطہ سرسید کی علمی اور اصلاحی فکر سے استفادہ کیا، تفصیل کے لیے دیکھیں محمد ضیاء الدین انصاری: مولانا آزاد سرسید اور علی گڑھ، ط: انجمن ترقی اردو، دہلی۔(۲۴) سرسید کی مفصل سوانح کے لیے دیکھیے ''حیات جاوید'' اور: (Lieut-Colonel Graham: The Life and work of Syad Ahmed Khan, P.London 1923)۔(۲۵) دیکھیے الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ط۳: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۷۔۴۱۔(۲۶) دیکھیں ابوالحسن الندوی، الاسلام والمستشرقون، ص۱۴ و ۱۵۔(۲۷) مستشرقین نے تاریخ وسیر کی تدوین کے لیے جو اصول وضوابط معین کیے تھے، علامہ نے اس سے استفادہ کیا اور اس کا اعتراف بھی جا بجا کیا ہے۔(۲۸) اس سفر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: شبلی نعمانی: سفر نامہ مصر وشام، ط: دارالمصنّفین، ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء۔(۲۹) شبلی نعمانی: سیرت النبی، ج۱، ص۲۱-۲۲۔(۳۰) ایضاً، ص۶۹۔(۳۱) اس اصول کے تفصیل کے لیے دیکھیں: اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ط: شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، ۱۹۹۹ء، ص۴۵۔(۳۲) نجیب العقیقی: المستشرقون، ج۲، ص۴۸-۴۹۔(۳۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: جوستاف بفانمولر: الاسلام فی الفکر الاستشراقی، ترجمہ محمود حمدی زقزوق، ط: قاہرہ، ص۱۱۳-۱۱۴/ ایضاً نجیب العقیقی: المستشرقون، ج۱، ص۲۱۷۴-۱۷۵۔(۳۴) سیرۃ الرسول

فی تصورات الغربیین ،فصول مختارۃ من کتابات المستشر ق الالمانی جوستاف بفانمولر ،ترجمہا وقدم لہا وعلق علیہا محمود حمدی زقزوق ،مجلّہ مرکز بحوث السنۃ والسیر ۃ ،العدد الثانی ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء، ڈاکٹر ویل نے ابن ہشام کا جرمنی زبان میں ۱۸۶۴ء میں ترجمہ کیا، سیرت النبی ، ج ا،ص ۶۶ ۔(۳۵) تفصیل کے لیے دیکھیں حوالہ سابق ص ۱۳۰-۱۳۱/ایضاً العقیقی :المستشر قون ، ج ۲،ص ۵۳، سیرت نبوی سے متعلق فصل کو علی ادھم نے عربی میں ترجمہ کیا پھر محمد السباعی نے بھی اس کا ترجمہ کیا، نیز اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، علامہ نے سیرت النبی میں جا بجا اس کتاب سے استدلال کیا ہے، دیکھیں: ج ا،ص ۱۲۶/ ج ۴،ص ۱۸۴-۱۸۵۔(۳۶) کوسن ڈی برسیوال ، ارمان (۱۲۰۹ - ۱۲۸۷ھ/۱۷۹۵ - ۱۸۷۱ء) Caussin de Perceval, A.P. (قومیت فرانس):اس نے اسلامی تاریخ کی بہت ساری کتابوں کا ترجمہ کیا جس میں سرفہرست نویری کی کتاب ''تاریخ صقلیہ'' ہے، اسی طرح ''مقامات حریری'' کا بھی ترجمہ کیا ، نیز ایشیاٹک میگزین میں عربی اسلامی تاریخ سے متعلق کئی گراں قدر مضامین شائع کیے، العقیقی :المستشر قون ، ج ا،ص ۱۶۵-۱۶۶۔(۳۷) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: عقیقی ، مستشرقون، ج ا،ص ۱۷۷-۱۷۸/محمود حمدی زقزوق :الاسلام فی الفکر الاستشر اقی ،ص ۸۶۔ (۳۸) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: عقیقی ، مستشرقون ، ج ۳،ص ۱۳۱۔

ملک الشعراء فیضی، ایک تجزیاتی مطالعہ

جناب حنیف نجمی٭

(۳)

فیضی عشق کے مقام و منزلت سے بخوبی واقف ہے۔ وہ عشق کی اس منزل میں ہے جہاں زبان ادب بند ہو جاتی ہے اور مستی و بے خودی میں دل کی بات بے ساختہ زبان پر آجاتی ہے۔

فیضی کو عشق کی بے پناہ و لامحدود قوت کا عرفان حاصل ہے۔ فیضی کے یہاں عشق کا جو رنگ پایا جاتا ہے وہ صفویہ دور کے شاعروں سے اس لحاظ سے منفرد و ممتاز ہے کہ اس میں حد درجہ پاکیزگی اور لطافت ہے اور اس رنگ عشق سے حسن ازل کے ساتھ حقیقی ربط و تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ فیضی کا عشق ہوس پرستی اور ہوس کاری کی آمیزش سے بالکل مبرا ہے۔ یہی وہ عشق ہے جو آدمی کو باطنی خباثتوں اور نفسی آلائشوں سے پاک کر کے اسے قلب و نظر کی طہارت اور فکر و خیال کی پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ فیضی جس کاروان شوق میں شریک و گرم سفر ہے وہ کارواں ناقہ و جرس کا محتاج نہیں۔ یہاں عشق کے بل پر مسافت طے ہوتی ہے اور درد عشق زاد راہ فراہم کرتا ہے ۔

جلوۂ کاروانِ ما نیست بناقہ و جرس شوق تو راہ می برد درد تو زاد می دہد

پیر رومی نے عشق کے باب میں کہا ہے کہ اگر عاشق کے غیر کا تماشائی ہے تو یہ عشق نہیں ہے وہ بے ہودہ اور دیوانہ ہے کیونکہ عشق تو ایسا شعلہ ہے کہ جب روشن ہوگیا تو معشوق کے علاوہ جو کچھ بھی ہے سب کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔

غیر معشوق ار تماشائی بود عشق نبود ہرزہ سودائی بود
عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

٭ فیصل ولہ، نیاپارا، ضلع دھمتری، چھتیس گڑھ۔

(مثنوی دفتر پنجم)

فیضی نے اس مضمون کو نہ صرف یہ کہ بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے بلکہ ''بجز متاع محبت کہ در پناہ من است'' کہہ کر اپنی بات کو ایک نئی جہت بھی دے دی ہے۔

دو عالم از اثر شعلۂ جمالش سوخت بجز متاع محبت کہ در پناہ من است

فیضی خود کو خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵) اور حسن دہلوی (۱۲۵۴-۱۳۳۷) کا مقلد کہتا ہے۔

وگر از پیرمن نظر جوئی روح فیاض خسرو و حسن است

عہد اکبری کے بیشتر شعراء کی طرح فیضی بھی ہندوستانی فارسی کے معروف اسلوب ''سبک ہندی'' کا شاعر تھا۔ سبک ہندی کے شعراء مضمون آفرینی کے شیدائی تھے یعنی نئے نئے مضامین کی تلاش جس کو بعد میں ''خیال بندی'' سے تعبیر کیا گیا۔ سبک ہندی کے حوالے سے ہندوستانی فارسی گو شاعروں میں بالعموم مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴-۱۷۲۰) اور ناصر علی سرہندی (م ۱۶۹۶) کے نام لیے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس اسلوب کے شیدائیوں کا کلام، دوراز کار اور بے لطف مضامین اور نئے نئے استعاروں اور تشبیہوں سے بھرا ہوا ہے لیکن عرفی، فیضی، نظیری، کلیم، ظہوری، صائب وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں نکتہ رسی، باریک بینی اور دقیق النظری کے ساتھ ساتھ بامزہ اور پرلطف مضامین بھی ہیں۔ کسی فارسی شاعر کا مشہور شعر ہے۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دوسرے مصرعے میں نہایت محکم دلیل پیش کی ہے۔ اب فیضی کو دیکھیے اس مضمون کو کس طرح ادا کرتا ہے۔

گر نہ لیلیٰ ہوس ہمرہئ مجنوں داشت ناقہ را بیہدہ در راہ گراں بار چہ کرد

(اگر لیلیٰ کے دل میں مجنوں کی ہمرہی کی ہوس نہ تھی تو اس نے راستے میں اونٹنی کو بے وجہ گراں بار کیوں کیا)۔

شبلی نعمانیؒ اور شیخ محمد اکرام دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ فیضی کے کلام میں جوش بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ فارسی میں خواجہ حافظ اس وصف میں بے نظیر سمجھے جاتے ہیں لیکن حافظ کا جوش بیان، رندی و میخواری کے مضامین تک محدود ہے۔ فیضی کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین جوش کے ساتھ ادا

کرتا ہے۔شبلی کے نزدیک فیضی جوش بیان کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔اس معاملے میں غالبؔ اردو میں کسی حد تک حافظؔ اور فیضیؔ کی ہمسری کرتے نظر آتے ہیں۔حافظ کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے ؎

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہ مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

(میں نہ قاضی ہوں نہ مدرس نہ کوتوال ہوں اور نہ فقیہ۔ مجھے کیا فائدہ کہ میں شراب خور کو شراب پینے سے روکوں)۔

ما ورد سحر بر در میخانہ نہادیم اوقات دعا در رہ جانا نہ نہادیم

(ہم نے صبح کے ورد کو میخانے کے دروازے پر رکھ دیا ہے۔دعا کے اوقات کو معشوق کے راستے میں رکھ دیا ہے)۔

تاز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود سر ما خاک رہِ پیر مغاں خواہد بود

(جب تک شراب خانہ اور شراب کا نام و نشاں باقی رہے گا اس وقت تک ہمارا سر پیر مغاں کی خاک راہ بنا رہے گا)۔

فیضی کا جوش بیان دیکھنا ہو تو چار ہزار اشعار کی مثنوی نل دمن پڑھیے۔شروع سے آخر تک وہی جوش وہی سرشاری ہے۔جوش بیان کا یہ رنگ عاشقانہ،فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین میں بھی نمایاں ہے۔

کردم نگارخانۂ دل را نظارۂ دیدم کہ صورت تو بہر سو کشیدہ اند

(میں نے دل کے نگار خانے کا نظارہ کیا تو دیکھا کہ اس میں ہر طرف تیری ہی شبیہ بنا دی گئی ہے)۔

فیاضی اگر عشق ترا خاک نشیں ساخت از دست مدہ سلطنت روے زمیں را

(فیاضی اگر عشق نے تجھ کو خاک نشیں بنا دیا تو اس خاک نشینی کو روے زمین کی سلطنت سمجھ اور اسے ہاتھ سے مت جانے دے)۔

مپرس اہل نظر چوں بعرش پیوستند کہ پا بہ کنگرۂ نہادہ برجستند

(یہ مت پوچھو کہ اہل نظر نے عرش تک کیسے رسائی حاصل کی۔بس یہ سمجھ لو کہ انہوں نے دل کے کنگورے پر پاؤں رکھ کر جست لگائی تو وہاں تک پہنچ گئے)۔

سفلہ را خانہ خرابی رسد از کثرت جاہ کشت ضائع ز فراوانیٔ باراں گردد

(کمینے شخص کے لیے دولت وثروت کی کثرت تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ بارش کی فراوانی سے کھیتی برباد ہوجاتی ہے)۔

فیضی کفم تہی و رہ عاشقی بہ پیش　　دیوان خود مگر بدو عالم گرو کنم

(فیضی میں تہی دست ہوں اور عاشقی کا مرحلہ درپیش ہے اب بجز اس کے کوئی اور چارہ نہیں کہ میں دونوں عالم کے عوض اپنا دیوان گرو رکھ دوں)۔

شبلی اور شیخ محمد اکرام، ملا صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ فیضی کی شاعری میں درد اور سوز واثر کی کمی ہے۔ شبلی کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص حکیم یا فلسفی ہو وہ عشق کی کڑیاں نہیں جھیل سکتا۔ سوز واثر عاشق تن شعرا کا خاصہ ہے۔

بہ سوز عشق شاہاں را چہ کاراست　　کہ سنگ لعل خالی از شراراست(۱)

بادشاہوں کو سوز عشق سے کیا کام۔ سنگ لعل میں کہیں شرار ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ فیضی نے زندگی کو شاہی دربار کے جھروکوں سے دیکھا تھا وہ تلخ حقیقتوں سے دوچار نہیں ہوا تھا اور بقول غالبؔ　ع　بے غم نہاد مرد گرامی نمی شود

ان دونوں حضرات کے بیانات سے تو یہی متبادر ہوتا ہے کہ شاعر کے انہیں جذبات و محسوسات میں درد اور سوز واثر ہوتا ہے جو اس کے حقیقی تجربات یا واقعیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن فارسی اور اردو شاعری کا معتد بہ حصہ ان خیالات کی تردید کرتا ہے۔ شعر کی تاثیر اور سحر کاری شاعر کی قدرت زبان و بیان اور اس کے انداز واسلوب پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر شاعر ان اوصاف سے عاری ہے تو واقعیت پر مبنی اشعار بھی درد واثر سے خالی ہوں گے۔

ملا صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ فیضی کا کلام ذوق عشق اور توحید و معرفت سے خالی ہے۔ ملا صاحب کا یہ بیان ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیخ کا نام شاب یا زنگی کا نام کافور رکھ دے۔ اس قسم کے بیان سے حقیقت تو بدلتی نہیں البتہ کچھ لوگ یا خود وہ شخص اپنے متعلق تذبذب اور وہم میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی می کند نسبت　　کہ من ہم درگماں افتادہ پندارم گنہگارم

(بدگمانی کی وجہ سے وہ اتنے گناہ مجھ سے منسوب کرتا ہے کہ میں بھی وہم میں پڑ جاتا ہوں اور سوچنے

لگتا ہوں کہ میں واقعی گنہگار رہوں)۔

ذوق عشق فیضی کے کلام میں کتنا ہے اور اس نے اس باب میں کیسے کیسے عالی قدر اشعار کہے ہیں یہ آپ گذشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں اور آیندہ صفحات میں بھی دیکھیں گے۔ کلام فیضی میں توحید و معرفت کے متعلق محمد حسین آزاد اور شبلی کے بیانات آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں۔ شبلی فیضی کو اس کی شاعری کے تناظر میں ''ملائے مسجدی'' اور آزاد ''موحد کامل'' کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیضی کا کلام توحید و معرفت، حکمت و دانش، نعت نبیؐ و منقبت اصحاب رسولؐ سے لبریز ہے۔ توحید و معرفت کا تو فیضی عاشق ہے۔ عرفان حق و توحید الٰہی کے عالی قدر مضامین کی ایک حسین کہکشاں اس کے کلام میں جگمگا رہی ہے۔ فیضی نہ صرف توحید و معرفت پر بہ کثرت شعر کہتا تھا بلکہ دوسرے شعراء کے عارفانہ و حکیمانہ اشعار کا دلدادہ بھی تھا۔ مثلاً اس کو شیخ سعدی (۱۲۱۰-۱۲۹۲) کا یہ شعر اس قدر پسند تھا کہ اس پر وجد کرتا تھا ؎

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

(اہل ہوش کی نظروں میں سبز پیڑوں کا ہر پتا معرفت الٰہی کا ایک دفتر ہے)۔

سعدی کا یہ شعر سن کر اکبر کا یہ شعر یاد آنا لازمی ہے ؎

اگر دیکھو تو ہر گل ایک دفتر ہے معانی کا اگر سمجھو تو ہر پتی بیانِ راز کرتی ہے

فیضی برسوں سے اس فکر میں تھا کہ معرفت الٰہی پر اس رتبے کا شعر کہے۔ چنانچہ ایک دن اس نے یہ شعر کہہ ہی ڈالا ؎

ہر بن مو کہ می نہم گوش فوارۂ فیض اوست در جوش

(میں جس بن مو کی جانب متوجہ ہوتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض خداوندی کا ایک فوارہ ہے جو جوش مار رہا ہے)۔

کہتے ہیں کہ یہ شعر کہہ کر فیضی بڑا خوش تھا اور خوشی کے عالم میں آنگن میں ٹہل رہا تھا کہ ایک چیل نے بیٹ کی جو اس کے منھ پر پڑی۔ اس کے منھ سے بے ساختہ نکلا

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد (۲)

(اوپر والوں کی سخن فہمی کا حال معلوم ہوگیا)۔

فیضی بادۂ توحید سے مست و سرشار ہے ۔ یہ وہ شراب ہے جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوتی اور جس کو یہ شراب میسر ہو اس کو عام قسم کی شراب (بادۂ انگوری) سے کیا واسطہ ۔

مکن ملامت فیضی اگر قدح نہ کشید　　　که او ز بادۂ توحید سرخوش دگراست

(اگر فیضی نے بادہ کشی نہیں کی تو اس کو ملامت مت کرو کیونکہ وہ شراب پیتا ہے لیکن جام توحید سے پیتا ہے جس کا سرور ہی کچھ اور ہے)۔

نشۂ فیضی بود از بزم خاص　　　جرعۂ جامش ز فیض عام نیست

(فیضی بزم خاص میں بادہ نوشی کرتا ہے۔ وہ شراب توحید پیتا ہے عام قسم کی شراب نہیں جو سب کو میسر ہو جاتی ہے)۔

فیضی کے قصیدۂ توحید کا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

سر بہ زمین درت بردن و برداشتن　　　نے بہ طریقت درست نے بہ حقیقت روا

(تیرے آستانے پر سر کو جھکانا اور پھر اٹھا لینا نہ طریقت کی رو سے درست ہے اور نہ حقیقت کے اعتبار سے جائز ہے)۔

حضرات صوفیہ کے یہاں ایک عام مضمون یہ بھی ہے کہ خدا کی ذات فہم و ادراک سے ماورا ہے اس کی کنہ پر غور کرنے سے حیرانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا ۔

ہرچہ اندیشی پذیرائے فناست　　　آنچہ در اندیشہ ناید آں خداست

(جو کچھ تو سوچتا ہے وہ فنا پذیر ہے۔ جو کچھ تیرے فکر و خیال کے احاطے میں نہیں آتا وہی خدا ہے)۔

ذہن میں جو گھر گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا　　　جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

(اکبرالہٰ آبادی)

اسی لیے حضرت اکبر اسیران عقل کو متنبہ کرتے ہیں ۔

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے　　　خدا کیا ہے خدا ہے اور کیا ہے

عرفی شیرازی (۱۵۵۵-۱۵۹۱) تو یہاں تک کہتا ہے کہ ادراک کے ذریعے کنہ ذات الٰہی تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ میری یہ بات بھی کلی صداقت کی حامل نہیں کیونکہ یہ بات بھی میں اپنے اندازۂ ادراک کے مطابق کہہ رہا ہوں ۔

حد کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من است

فیضی اپنے خامۂ معجز نگار سے چار ترکیبیں تراشتا ہے۔ بیش گداز، دانش گسل، اندیشہ کاہ، حیرت فزا اور بحر معانی کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔

نور تو بیش گداز حسن تو دانش گسل فکر تو اندیشہ کاہ کنہ تو حیرت فزا

تنگ نظر اور تنگ دل علم والوں کو چونکہ قیل و قال اور بحث و تکرار کی عادت ہوتی ہے۔

ع بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت (اقبال)، اس لیے فیضی نکتۂ توحید کی نسبت ان فتنہ پردازوں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

با اہل جدل نکتۂ توحید نگوئیم در وحدت حق چوں و چرا را نشناسیم

(نکتۂ توحید کی بابت ہم ان علمائے جدل و فساد سے گفتگو نہیں کرتے کیونکہ یہ لوگ چوں و چرا کے خوگر ہیں اور وحدت حق میں چوں و چرا کی کوئی گنجائش نہیں ہے)۔

اکبرالٰہ آبادی نے سچ کہا ہے۔

مبتلائے بحث کو راز خدا کی کیا خبر معنئ بے لفظ و لفظ بے صدا کی کیا خبر

سوداؔ (۱۷۰۶-۱۷۸۱) اور مومن (۱۸۰۰-۱۸۵۲) نے درج ذیل اشعار میں خدا کے باہمہ و بے ہمہ ہونے کا جو مضمون باندھا ہے، فیضی نے اسے کتنے سہل و سادہ انداز میں ادا کر دیا ہے۔

اس قدر سادہ و پرکار کہیں دیکھا ہے بے نمود اتنا نمودار کہیں دیکھا ہے
(سوداؔ)

ہر جائے ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
(مومنؔ)

خانہ نہ داری ولے از تو ہمہ خانہ پر جائے نہ داری ولے از تو تہی نیست جائے
(فیضیؔ)

(اگرچہ تیرا کوئی گھر نہیں لیکن ہر گھر تیری موجودگی سے بھرا ہوا ہے۔ تیرا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں لیکن کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں تو موجود نہ ہو)۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کا راستہ تمام تر خارزار ہے اور برہنہ پا سفر کرنا ہے۔ اس

صورت میں منزل پر پہنچنے کا بس ایک ذریعہ ہے وہ یہ کہ تسلیم ورضا کی سواری ہاتھ آ جائے ۔

راہ رواں برہنہ پا راہ تمام خارزار تا بہ مقام خودرسی راحلہ از رضا طلب

(زبور عجم، حصہ دوم)

فیضی صدمات قضاوقدر کو ''خدا کے ہاتھ کے طمانچے'' (لطمہ ہاے یداللہ) کہتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ آلام ومصائب سے آدمی کو روحانی و باطنی ارتفاع وعروج حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ابتلا وآزمائش کے ذریعے نفس انسانی کی کثافتوں کو دور کرتا ہے اور اسے زر خالص بناتا ہے۔اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ شیوۂ رضا اختیار کرے اور مصائب وآلام کو عین رحمت الٰہی سمجھ کر شگفتہ روئی وخندہ جبینی سے برداشت کرے ۔

روے کشادہ باید و پیشانی فراخ آنجا کہ لطمہ ہاے ید اللہ می زنند

جو شاعر ایسا بلند رتبہ شعر کہہ سکتا ہو وہ اگر اپنے شعر وفن کی نسبت یہ بھی کہے تو جائز ہے کہ اس تعلّی کا اس کو حق پہنچتا ہے ۔

فیضی ز صریر قلمت باد وزان است آں باد کہ برگ شجر طور فرو ریخت

(فیضی تیری قلم کی آواز کے اثر سے ہوا چل رہی ہے۔ایسی ہوا جس کے زور سے شجر طور کے پتے جھڑ گئے)۔

اقبال نے ''فلسفۂ غم'' اور ''نوائے غم'' کے عنوانات سے دو نظمیں لکھی ہیں جو بانگ درا میں شامل ہیں، ان نظموں میں انہوں نے متذکرۂ بالا مضمون کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔فیضی کے منقولۂ بالا شعر کے تناظر میں یہ دو شعر خصوصی اہمیت رکھتے ہیں ۔

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

''فلسفۂ غم''

جس طرح رفعت شبنم ہے مذاق رم سے میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

''نوائے غم''

جہاں تک تصوف کے ایک اہم جزو وحدت الوجود کا تعلق ہے تو یہ بلاشبہ فارسی شاعری (اور کم وبیش اردو شاعری کا بھی) کا جزو اعظم ہے، بقول شبلی نعمانی فارسی شاعری کا آدھا سرمایہ یہی ہے۔صوفیہ شعراء کی تمام کائنات یہی ہے۔صوفیانہ انداز فارسی شاعری میں اس قدر مقبول ہوا

کہ تمام شعراء اسی انداز میں کہنے لگے وہ بھی جو بادۂ تصوف کے ذوق چشیدہ تھے اور وہ بھی جو صرف نظریاتی طور پر تصوف کے قائل تھے۔ اس قبیل کے شعراء نے رسماً یا ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کے مصداق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ بہ الفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جن شعراء کے دلوں پر فی الحقیقت وحدت الوجودی افکار کا استیلا تھا انہوں نے تو صوفیانہ اخلاق کے زیر اثر کفر و اسلام، سبحہ و زنار، کعبہ و بت خانہ، گبر و مسلماں وغیرہ کی تمیز اٹھادی اور ان کی دیکھا دیکھی ان شعراء نے بھی ان خیالات کو دہرانا شروع کر دیا جو صرف نظری لحاظ سے صوفی تھے جن کو شعرائے متصوفین کہتے ہیں۔ (۳)

فلسفہ ویدانت کی طرح وحدت الوجودی تصوف بھی کعبہ و بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن مانتا ہے۔ اس لیے مختلف مذاہب و مسالک کے درمیان تفریق و تمیز کی وہاں کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں گیر (۱۵۰۸-۱۶۲۷) نے اپنی تزک میں بابا فغانی (م ۱۵۱۹) کا درج ذیل شعر نقل کر کے لکھا ہے کہ اس شعر میں شاعر نے ویدانت کے مضامین کا نچوڑ پیش کر دیا ہے ۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں هر طرف می نگرم انجمنے ساختہ اند[۴]

(اس گھر میں صرف ایک چراغ ہے، میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں اسی ایک چراغ کی روشنی سے انجمن آراستہ ہے)۔

دیکھیے فیضی کا دوست عرفی اس مضمون کو کتنے موثر و مدلل اسلوب میں ادا کرتا ہے ۔

عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

اہل یونان اور اہل ہند دونوں وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے قائل تھے اس لحاظ سے یہ فکر بہت قدیم ہے تاہم اہل اسلام میں اس کا واضح آغاز وظہور اس وقت ہوا جب محی الدین ابن عربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰) نے اس کی توضیح وتشریح میں حد درجہ انہماک سے کام لیا۔ فارسی شاعری میں اس فکر کے واضح نقوش ہمیں شیخ ابوسعید ابوالخیر (۹۶۷-۱۰۴۹) کے زمانے سے ہی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اقبال کے ایک خط میں شیخ ابوسعید ابوالخیر کی یہ رباعی بطور مثال پیش کی گئی ہے جس میں اسلام کے ایک اہم رکن جہاد کی تخفیف کی گئی ہے ۔

غازی پئے شہادت اندر تگ و پوست غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست

در روز قیامت ایں بداں کے ماند کیں کشتۂ دشمن است وآں کشتۂ دوست

(غازی شہادت کے لیے تگ و دو میں مصروف ہے، اس کو خبر نہیں کہ شہید عشق کا مرتبہ اس سے برتر ہے۔ قیامت کے دن وہ اس کے برابر کیسے ہوگا؟ یہ دشمن کا مقتول ہے اور وہ دوست کا)

اس قسم کے افکار و خیالات کے نقوش ہمیں شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ہم عصر بابا طاہر عریاں (م۱۰۱۰) اور ان کے بعد خواجہ عبداللہ انصاری (۱۰۰۶-۱۰۸۹) کے یہاں بھی مل جاتے ہیں۔

ایک تاثر یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا شعائر و رسوم اسلامی پر طنز و تعریض پر مبنی خیالات کا اظہار فیضی یا اس کے ہم عصر شعراء نے ہی کیا ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں سر دست بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر (م۱۰۶۹) اور فیضی (م۱۵۹۵) کی وفات کے درمیان تقریباً پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

جیسا کہ متذکرہ بالا معروضات سے واضح ہے فارسی کی متصوفانہ (عشقیہ) شعری روایت میں عشق کو کفر اور بت پرستی سے تعبیر کرنے کی روایت کا سراغ امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵) سے بہت پہلے دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں مل جاتا ہے لیکن اس روایت کو مستحکم بنانے کا سہرا امیر خسرو کے سر ہے جنہوں نے اپنی بت پرستی اور بت کافر کی نامسلمانی کا ذکر کر کے جہاں ایک طرف اہل تصوف (اہل عشق) کی وسیع المشربی کا اظہار کیا وہیں دوسری طرف مذہب کے ظواہر و رسوم پر حقیقی روحانیت، باطنی پاکیزگی اور تزکیہ نفس کی اہمیت و فضیلت واضح کرنے کے لیے تسبیح و زنار دونوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ خسرو واشگاف انداز میں کہتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق کا کافر ہوں مجھے اسلام کی ضرورت نہیں، میری ہر رگ تار بن گئی ہے مجھے زنار کی ضرورت نہیں)۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند آری آری می کنم با خلق مارا کار نیست

(لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے، ہاں ہاں میں بت پرستی کرتا ہوں لوگوں سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے)۔

اس طرح کے اشعار سن کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس باب میں تنگ نظر، اہل جدل کا ردعمل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات ایسے شعرا کو بے دھڑک کافر و ملحد کہہ دیں گے۔ لیکن اس

معاملے میں ایک بڑی مشکل بھی ہے وہ مشکل یہ ہے کہ اس قبیل کے دو چار نہیں سیکڑوں ایسے شعراء بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی شخصیتوں کے گرد مذہبی تقدس اور روحانی عظمت کا ایک کہکشانی ہالہ ضوء فگن ہے اور ان میں بعض تو ایسے ثقہ بزرگ ہیں جن کی حقیقی دین داری، مخلصانہ خدا پرستی اور بے ریا زہد و تقشّف ایک معروف و مسلم حقیقت ہے، جس سے شاید ہی کوئی باشعور شخص انکار کر سکے۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر کی بزرگی اور روحانی مرتبے سے کون انکار کرے گا۔ ملحوظ رہے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی صحبت کیمیا اثر میں ابن سینا (۹۸۰-۱۰۳۷) نے چند گھنٹے گزارے تھے اور جب لوگوں نے ان سے پوچھا تھا کہ شیخ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے تو ابن سینا نے کہا تھا

آنچہ می دانم او می بیند

یعنی جن چیزوں (حقائق) کا مجھے صرف علم ہے ان چیزوں کو شیخ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر ایمان و عرفان کی کس منزل میں تھے۔ شیخ کی ایک رباعی آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ واضح رہے کہ شیخ پہلے صوفی شاعر ہیں جنھوں نے مضامین و مسائل تصوف کو نظم کیا۔ اب شیخ کی ایک اور رباعی ملاحظہ فرمایئے اور خیال کیجیے کہ اس رباعی کا مضمون (وحدت ادیان) نصوص قرآنی سے کس درجہ متصادم ہے۔

راہ تو بہر قدم کہ پویند خوش است　　　وصل تو بہر سبب کہ جویند خوش است

روے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　　نام تو بہر زباں کہ گویند خوش است

(تیری راہ جس قدم سے طے کی جائے اچھا ہے، تیرا وصل جس وسیلے سے تلاش کیا جائے اچھا ہے۔ تیرے چہرے (جلوہ) کو جس آنکھ سے دیکھا جائے اچھا ہے، تیرا نام جس زبان سے لیا جائے اچھا ہے)۔

اس رباعی میں جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے اس کی رو سے ہر دین دین حق ہے اور ہر مسلک خدا ہی کا راستہ ہے اور کعبہ و دیر اور کفر و اسلام میں جو فرق ہے وہ صرف لفظی اور اصطلاحی ہے، اس عقیدے کے بالکل برخلاف قرآن کریم واشگاف انداز میں اعلان کرتا ہے:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۔　　　یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران: ۱۹)

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ　　　جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش

يُقبَلَ مِنهُ ۔	کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا
(آل عمران:۸۵)	جائے گا۔(۵)

ایسے اشعار ان شعراء کے یہاں بھی بہ آسانی مل جاتے ہیں جو شیخ ابوسعید ابوالخیر ہی کی طرح فیضی سے بلکہ خسرو سے بھی پہلے گزرے ہیں مثلاً شیخ فریدالدین عطار (۴۳-۱۱۴۲- ۱۲۲۰) کا مشہور شعر ہے ۔

لب دریا ہمہ کفر است و دریا جملہ دین داری ولیکن گوہر دریا و رای کفر و دیں باشد

(دریا کا کنارا سارا کا سارا کفر ہے اور دریا تمام تر دین داری ہے لیکن دریا میں پایا جانے والا موتی کفر اور دین دونوں سے بالاتر ہے)۔

عطار نے اسی بات کو ایک جگہ اور وضاحت سے پیش کیا ہے ۔

عشق بالاے کفر و دیں دیدم برتر از شک و از یقیں دیدم

کفر و دین و یقین و شک ہر چار ہمہ با عقل ہمنشیں دیدم

چوں گذشتم ز عقل صد عالم چوں بگویم کہ کفر و دیں دیدم

حضرت شیخ احمد سرہندی اپنے ایک مکتوب میں عطار کے یہ اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''بعد از تجاوز از مرتبۂ عقل نہ کفر در نظر	عقل کے مرتبے سے آگے گزر جانے کے
آرد نہ دین وایمان''۔(۶)	بعد نہ کفر کو دیکھتا ہے نہ دین وایمان کو۔

مولانا رومی (۱۲۰۷-۱۲۷۳)، خواجوے کرمانی، حافظ شیرازی (۱۳۲۵-۱۳۸۹)، صائب تبریزی (۱۵۸۰-۱۶۷۱)، حاجی محمد جان قدسی (م ۱۶۴۶)، میرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴-۱۷۲۰)، محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵-۱۶۱۱)، ولی (۱۶۶۵-۱۷۷۷)، سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۶-۱۷۵۸)، آبرو (۱۶۸۲-۱۷۳۳)، شاہ حاتم (۱۶۹۹-۱۷۸۰)، سودا (۱۷۰۶ -۱۷۸۱)، بقا اکبرآبادی (م۹۲-۱۷۹۱)، خواجہ میر درد (۱۷۲۰-۱۷۸۵)، میر (۲۴-۱۷۲۳- ۱۸۱۰)، آتش (۱۷۷۷-۱۸۴۷)، مومن (۱۸۰۰-۱۸۵۲)، ذوق (۱۷۸۹-۱۸۵۴)، غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹)، اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸)(۱۰۶)، ان سب کے کلام میں ایسے شواہد کثرت

سے موجود ہیں اور جن سے اہل نظر واقف بھی ہیں، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جس متصوفانہ (عشقیہ) شعری روایت کی تقلید میں فارسی اور اردو کے سیکڑوں شعراء منقولہ بالاقسم کے اشعار صدیوں سے کہتے آئے ہیں اسی روایت کی عکاس فیضی کی شاعری بھی ہے جس میں ایک طرف ظواہر و رسوم دین کے مقابلہ میں حقیقی روحانیت اور باطنی پاکیزگی کو ترجیح دی جاتی ہے تو دوسری طرف جامد و محدود مذہبی فکر کے علی الرغم وسیع النظری اور فراخ مشربی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس روایت کا خمیر وحدت الوجودی فکر سے تیار ہوا ہے۔ فیضی اور خسرو کے یہاں بھی ہمیں اس فکر کے نقوش دکھائی دیتے ہیں ۔

عجب گداز دل فیضیؔ ندیدہ ایم طلسم   کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص

(فیضی کے دل سے زیادہ انوکھا ہم نے کوئی طلسم نہیں دیکھا، یہ موتی بھی ہے، سمندر بھی ہے، غواص بھی ہے)۔

ہرچہ آید نظر غیر تو نیست   یا توئی یا بوئے تو یا خوئے تو (خسروؔ)

(جو کچھ نظر آتا ہے وہ تیرا غیر نہیں ہے یا خود تو ہی ہے یا تیری خوشبو ہے یا تیری صفت ہے)۔

لہٰذا فیضی ہو یا کوئی اور شاعر اگر وہ مذکورہ بالا شعری روایت کے تحت وسیع المشربی اور آزاد خیالی پر مبنی افکار و خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اسے کافر و ملحد کہنا غلط ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ خسرو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (۱۲۳۸-۱۳۲۵) کے چہیتے مرید تھے۔ عبادت و اطاعت الٰہی کے پیکر تھے۔ عشق الٰہی کی اتنی اعلیٰ و ارفع منزل پر فائز تھے کہ جب سلطان جیؒ دعا کرتے تھے تو امیر خسرو کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے ۔

الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بخش

(خداوندا مجھے اس ترک کے سوز سینہ کے صدقے میں بخش دے)۔

وہی خسرو یہاں تک کہہ جاتے ہیں ۔

دیوانۂ بتاں نکشد رو بکعبہ زانکہ   تعظیم کعبہ کفر بود بت پرست را

(بتوں کا دیوانہ کعبے کی طرف رخ نہیں کرتا کیونکہ بت پرست کے لیے کعبے کی تعظیم کفر ہے)۔

خسرو اسی پر بس نہیں کرتے آگے اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں ۔

من چو ہندوے سومنات بہ عشق　　بت پرستیم و دل برہمن ماست

(میں عشق کے سومنات (مندر) میں ہندو (ہندوستانی) بت پرست ہوں۔ دل میرا برہمن ہے)۔

فیضی تو اس حد تک بھی نہیں گیا۔ اس قبیل کے شعراء کے اشعار کی تفہیم و تحسین میں اس مخصوص شعری روایت اور اس سے متعلق رجحانات و میلانات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جہاں اس نکتے کو ملحوظ نہیں رکھا گیا وہاں اشعار کی تشریح و توضیح کسی نامور شخصیت کے قتل کا سبب بن گئی ہے۔ بلکہ بعض اوقات وقت کے ارباب اقتدار نے اپنے مخصوص سیاسی مقاصد و مفادات کی تکمیل کی خاطر مجاذیب و مجانین کے شعری اظہارات سے غلط مفہوم اخذ کر کے ان کے قتل کا جواز نکال لیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سرمدؔ کے قتل (۶۱-۱۶۶۰) کے جواز کی خاطر جہاں ان کی برہنگی اور نصف کلمہ پڑھنے کو بنیاد بنایا گیا وہیں ان کی ایک رباعی کو بھی بطور دلیل پیش کیا گیا جس سے یہ (غلط) مفہوم اخذ کیا گیا کہ سرمدؔ رسول کریم ﷺ کی معراج کے منکر ہیں حالانکہ سرمدؔ کے قتل کے اسباب و محرکات سیاسی تھے۔ چنانچہ مآثر الامراء کے مصنف شاہ نواز خاں کو سب کچھ لکھنے کے بعد آخر میں یہ بھی لکھنا پڑا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ دارا شکوہ کی مصاحبت اور سرمد سے شاہ جہاں کی ارادت و عقیدت ہی سرمد کے قتل کا اصل سبب تھی:

"اگر راست گفتہ شود علت اصلی قتل مصاحبت دارا شکوہ و ارادت شاہ جہاں بود بہ سرمد"۔ (۷)

فیضی کی بدنامی اور کردارکشی کے اسباب و عوامل بھی سیاسی تھے ورنہ دور کیوں جایئے اس کے دو اہم معاصر شعراء غزالیؔ (۱۵۷۲-۱۵۲۷) اور عرفیؔ (۱۵۹۱-۱۵۵۵) ہی کو دیکھ لیجیے۔ کیا یہ دونوں شاعر وسیع المشربی اور آزاد خیالی کے اظہار میں فیضی سے کچھ کم ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ملا صاحب نے غزالی پر بھی الحاد کا الزام لگایا ہے لیکن اس کے کلام کی تعریف کی ہے، خاص طور پر اس کے رنگ تصوف کا بڑے تحسینی انداز میں ذکر کیا ہے۔ عرفی کے کچھ اشعار آپ پڑھ چکے ہیں چند اشعار اور ملاحظہ فرمایئے۔

گاہ زناری حمایل گاہ تسبیحی بدست　　تا شود روشن کہ من دیوانہ بے مذہبم

(میں کبھی زنار پہنتا ہوں اور کبھی ہاتھ میں تسبیح رکھتا ہوں تا کہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ میں کسی مذہب

کا پیرو نہیں ہوں ۔ دیوانہ بے مذہب ہوں)۔

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بت خانہ خوشتر است ہر جا کہ ہست جلوۂ جانانہ خوشتر است

(یہ کبھی مت کہو کہ کعبہ بت خانے سے بہتر ہے کیونکہ جس جگہ بھی جلوۂ جانانہ ہو وہ جگہ اچھی ہے)۔

خواہی بکعبہ روکن و خواہی بسومنات دل برمکن کہ شش جہت از بہر طاعتست

(تو اپنا منھ خواہ کعبے کی طرف کرلے خواہ سومنات کی طرف اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ کسی سمت سے اپنے دل کو میلا مت کر ۔ چھ سمتوں میں سے کسی بھی سمت کی طرف منھ کر کے اس کی عبادت کی جاسکتی ہے)۔

ایک رباعی میں کہتا ہے کہ میں مندر کے دروازے پر گیا تو اہل مندر نے میرے لیے دروازہ کھول دیا ۔ میرے سر سے عمامۂ شیخی اتار کر ایک طرف رکھ دیا ۔ میری تسبیح کو بت کی گردن میں حمائل کر دیا اور میرے اسلام کو کعبے میں بھیج دیا ۔

رفتم بدر دیر و درم بکشادند عمامۂ شیخی ز سرم بنہادند
تسبیح مرا بگردن بت بستند اسلام مرا بکعبہ بفرستادند

اور عرفی کے یہ اشعار تو حسن شہرت اور حسن قبول سے مشرف ہو چکے ہیں ۔

فقیہاں دفترے را می پرستند حرم جویاں درے را می پرستند
بر افگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند

(فقہاء قیل وقال کے دفتر بنا کر اور خدا کی بابت انہیں حق سمجھ کر ان کی پرستش کر رہے ہیں ۔ کعبے کے متلاشی اس کے دروازے کی پوجا کر رہے ہیں ۔ اے خدا اپنے چہرے سے ذرا پردہ ہٹا دے تا کہ یار لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ جس چیز کو خدا سمجھ کر پوج رہے ہیں وہ خدا نہیں کچھ اور ہے)۔

خدا معلوم اس قسم کے اشعار کہنے والے فیضی کے دوست عرفی کو ملا صاحب نے کیونکر بخش دیا ۔ بہتر ہوگا کہ آخر میں ہم ادبیات کے جید الاستعداد عالم اور فلسفی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تشریحات بھی نقل کر دیں جو اگر چہ انہوں نے غالب کے حوالے سے پیش کی ہیں تاہم ان میں فیضی کے وہ اشعار بھی آگئے ہیں جن کا حوالہ دے کر شیخ محمد اکرام اور پروفیسر وارث کرمانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں :

''فارسی شاعری کا ایک معتد بہ حصہ کفر و دین، عقل و عشق اور ظاہر و باطن کی کشاکش سے بھرا ہوا ہے۔ بعض لوگ حکیم تھے اور اس کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ بعض نظری اور عملی لحاظ سے صوفی تھے اور اس کے ساتھ شاعر بھی تھے جیسے سنائی، عطار اور رومی ہیں۔ بعض فقط نظری طور پر تصوف کے بارے میں متلذذ بالمسائل تھے اور شاعر تھے، جنہیں شعرائے متصوفین کہتے ہیں۔ یہ کشاکش کفر و الحاد کی کشاکش نہیں بلکہ اکثر جگہ ظاہریت اور معنویت کی پیکار ہے۔ عام لوگ اور اکثر فقیہ دین کے بارے میں اصول و فروع میں زیادہ فرق و امتیاز نہیں کرتے۔ اپنے مذہب کے شعائر و رسوم کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتے ہیں جتنا تزکیۂ نفس اور اس انداز نگاہ کو جو حقیقی روحانیت کا مقصود ہے۔ امام غزالی جو فقیہ ہونے کے علاوہ حکیم اور صوفی بھی تھے، اپنے زمانے کے فقہاء سے سخت ناراض تھے۔ فقہ میں الجھ کر مناظرہ بازی کرنے والوں کو انہوں نے بھی دین کی حقیقت سے ناآشنا سمجھا۔ غالبؔ کی نظر رسوم و قیود اور شعائر مذہبی کے مقابلے میں باطنی انداز نفس پر زیادہ مرتکز ہے، وہ اکثر فقیہانہ بحثوں کو بیکار سمجھتا ہے اور فیضی کا ہم خیال معلوم ہوتا ہے، فیضی نے ایک پوری غزل ایسے فقہاء کے متعلق لکھی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ فرائض کے ملایانہ جھگڑے خدا کرے کہ انہیں کوئی نہ پڑھے۔ ان کے متعلق فیضی سے مت پوچھو یہ تو مردہ نہلانے والوں کا کام ہے۔

مشاجرات فرائض کہ کس مخور ناذش   از و مپرس کہ آں علم مردہ شویان است

فیضی کہتا ہے کہ میں حکیم ہوں حادث و قدیم کا عالم ہوں مجھ سے بلند قسم کی باتیں سنو۔

امروز نہ شاعرم حکیم   دانندۂ حادث و قدیم

حافظ علیہ الرحمہ نے انہیں جھگڑوں سے بے زار ہو کر کہا تھا۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد   وائے گر در پس امروز بود فردائے

شعائر و رسوم کے مقابلے میں حکمت دین اور اصل روحانیت و اخلاق پر نظر رکھنے والا شخص وسیع النظر و سیع المشرب ہو جاتا ہے۔ صوفیہ اور بعض اساطین حکماء کا یہ مشترک عقیدہ ہے کہ ذات الٰہی نہ حسی ادراک کا معروض بن سکتی ہے اور نہ عقلی ادراک کا۔ اسی لیے بقول شبلی کعبے کے در و دیوار کی تعظیم میں مسلمانوں کا جو طریق عمل ہے اس میں فیضی کو ظاہر پرستی کا شائبہ صاف دکھائی دیتا ہے، چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے۔

آں کہ می کرد مرا منع پرستیدن بت　　　در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

لیکن پھر غور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کعبہ پرستوں کی یہ اخیر منزل نہیں مقصود اصلی وہی ذات بحت ہے۔ ارتقاء کوش برگزیدہ ہستیوں کے آثار حکمت آموز اور بصیرت افروز ہیں لیکن انسانی زندگی کا آئین یہی ہونا چاہیے کہ ''در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم''، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ روحانی ترقی میں جلد آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہ پہلے پیشوایان دین کے آثار پر رک جاتے ہیں ان کے لیے مناسب بھی یہی ہوتا ہے اس لیے فیضی کہتا ہے۔

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس　　　گہہ گہے پسماندگان راہ منزل می کنند

لیکن جب کوئی ملت دیر تک ظواہر پر اٹک جائے تو اس کا روحانی تنزل شروع ہو جاتا ہے اسی لیے غالب کہتا ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود　　　قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

فیضی بھی غالب کی طرح کعبے سے مراد ظواہر دین لیتا ہے۔ اس کی نظر میں بھی یہ سنگ و خشت کا قبلہ غیر مرئی معبود (ذات بحث) کے لیے قبلہ نمائی کرتا ہے۔ سنگ و خشت کے کعبے میں تو شکست و ریخت بھی ہوتی ہے اصل کعبہ ایک قصر بے قصور ہونا چاہیے۔ اس لیے فیضی کہتا ہے کہ آؤ نور و تجلی کے کعبے کی طرف رخ کریں۔

بیا کہ روے بہ محراب گاہ نور نہیم　　　بنائے کعبۂ دیگر ز سنگ طور نہیم

حطیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت　　　بتازہ طرح یکے قصر بے قصور نہیم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ اشعار علامہ اقبال کو سنائے تو بے حد متاثر ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد فرمانے لگے کہ وہ اشعار میرے اندر گونج رہے ہیں۔ شاید میرے اندر سے بھی کچھ نکلوائیں گے (۱۰۸)۔ کیا حرج ہے اگر فیضی کی شاعری کے رنگ و آہنگ کو مزید روشن کرنے کے لیے بطور عطر مجموعہ یہاں کچھ منتخب اشعار درج کر دیے جائیں:

عشق تا پائے بیفشرد و در اندیشۂ ما　　　ہمہ معشوق ترا ود ز رگ و ریشۂ ما

از تف بادۂ ما مال ملائک بگداخت　　　وائے آں روز کہ برقے جہد از شیشۂ ما

مشتے از جو بکف آریم و بکاریم زنو　　　آنچہ کشتیم ز خجلت نتواں کردد رو

شراب عیش مجو فیضی از جہاں کہ سپہر | خمے تہی است کہ برخاک واژگوں زدہ اند
حدیث لیلیٰ و مجنوں شنیدہ می گویم | کہ فتنہ خیز ترآمد زمانۂ من و تو
غافل نیم ز راہ وے آہ چارہ نیست | زیں رہزناں کہ بردل آگاہ می زنند
ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگ رہ ما بود | رفتیم و صنم برسر محراب شکستیم
حیران فسوں سازئ عشقم کہ خیالت | از دیدہ دروں آید و در سینہ نگنجد
مرا براہ محبت دو مشکل افتاد است | کہ خوں گرفتہ ام و یار قاتل افتاد است
اگر سرے نہ کشم سوے بیخودی چہ کنم | مرا ز ہمدمئ خود ملال می گیرد
آں نیست کہ من ہم نفساں را بگذارم | با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

اصحاب یقینیم گماں را نہ پسندیم | ارباب صوابیم خطا را نہ شناسیم
بردانش ما انجم و افلاک بخندند | گر صاحب لولاکؐ لما را نہ شناسیم

(نعتیہ اشعار)

حوالے

(۱) شعرالعجم، ج ۳،ص ۶۴ ۔ (۲) یہ مقولہ تین شکلوں میں ملتا ہے: ۱-سخن فہمئ عالم بالا معلوم شد، ۲- قدر دانئ عالم بالا معلوم شد، ۳- شعر فہمئ عالم بالا معلوم شد۔ (۳) شعرالعجم، ج ۵،ص ۱۳۴، ۱۳۵۔ (۴) تزک جہانگیری اردو ترجمہ از مولوی احمد علی رام پوری، مکتبۃ الحسنات، دہلی ۲۰۰۷،ص ۲۰۸۔ (۵) اردو ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی سے ماخوذ ہے۔ (۶) دفتر اول مکتوب ۲۹۰، مکتوبات امام ربانی مرتبہ حسین حلمی، ادب منزل کراچی ۱۹۷۷۔ (۷) عاشقانہ ہاے یک باغی از سید عبدالحمید ضیایی، ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی، طبع ۲۰۰۹، ص ۱۰۔ (۸) افکار غالب، ص ۳۰، ۳۱، ۴۱۷، ۴۴۸۔ نوٹ: فیضی، عرفی، غالب، رومی اور حافظ کے اشعار سے متعلق جہاں کوئی اور حوالہ درج نہ ہو وہاں ان شعراء کے اشعار کو درج ذیل کتابوں سے ماخوذ سمجھا جائے:

۱-کلیات فیضی مرتبہ اے ڈی ارشد، لاہور ۱۹۶۷، ۲-کلیات اشعار عرفی شیرازی مرتبہ جواہری وجدی کتاب خانہ سنائی تہران ۱۹۵۷، ۳-کلیات غالب فارسی مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۸ ۴-مثنوی مولانائے روم، سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۵-دیوان حافظ، سب رنگ کتاب گھر دہلی۔

ذکاءاللہ-ایک مطالعہ

پروفیسر اقبال حسین

ہندوستان کی تاریخ میں سرسیدؒ کو اپنی ہشت پہلو شخصیت کی وجہ سے ایک اہم مقام حاصل ہے وہ نہ صرف ایک بڑے مفکر، مدبر، معلم، قائد اور عاشق رسولؐ تھے بلکہ ایک مورخ بھی تھے جنہوں نے اردو زبان میں تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی اور اسے جدید تقاضوں کی روشنی میں اردو داں طبقہ سے روشناس کرایا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ ان کے ہم عصر جو عمر میں ان سے چھوٹے تھے، ان کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور اپنی تحریر میں ان کے اسلوب کو کسی حد تک اختیار کیا۔ اس دور میں تاریخ نویسی کے میدان میں ہمیں دو بڑے نام ملتے ہیں یعنی مولانا شبلیؒ اور مولوی ذکاءاللہؒ جنہوں نے سرسید کی تحریک پر اردو میں تاریخ نویسی کی طرف توجہ دی، سرسید نے تاریخ نویسی کی ابتداء آثارالصنادید سے کی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں اسباب بغاوت ہند، تاریخ بجنور اور سرکشی ضلع بجنور لکھی۔ مولانا شبلیؒ کی الفاروق اور المامون جیسی معرکۃ الآراء کتابیں اردو تاریخ نویسی میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ مولوی ذکاءاللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سرسید کی ترغیب پر ہندوستان کی مختصر تاریخ برائے مطالعہ طلبائے مدرسۃ العلوم، علی گڑھ لکھی تھی (۱)۔ غالباً یہی کتاب ہندوستان پر ایک جامع تاریخ مرتب کرنے کی بنیاد بنی اور بعد ازاں انہوں نے ہندوستان کی تاریخ زمانہ قدیم تا انیسویں صدی مرتب کی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے واقعات انہوں نے ایک الگ جلد میں تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ کے نام سے شائع کی۔ تاریخ کے علاوہ مولوی ذکاءاللہ نے ریاضی، جو ان کا پسندیدہ مضمون تھا، جغرافیہ، علم اخلاق، طبعیات و ہیئت، سیاست وتمدن پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھے۔ اس طرح ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۱۲۹ ہے۔ چودہ کتابیں غیر مطبوعہ

علی گڑھ۔

تھیں۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے اپنے مضمون میں مولوی ذکاء اللہ کی مطبوعہ کتابوں کی کل تعداد ۱۴۶ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۱۴ لکھی ہے۔(۲)

مولوی ذکاء اللہ ۲۰/اپریل ۱۸۳۲ء کو جامع مسجد اور دہلی محل کے درمیان واقع ایک مکان میں پیدا ہوئے تھے(۳)۔ان کے سوانح نگار سی۔ایف اینڈریوز کے مطابق جن کو مولوی صاحب نے وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کے حالات بتلائے تھے، لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب کا خاندان کئی نسلوں سے مغل بادشاہوں سے وابستہ تھا(۴)۔مولوی صاحب کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول سے ملتا ہے(۵)۔ہندوستان آنے سے پہلے مولوی صاحب کا خاندان غزنی میں آباد تھا۔یہ واضح نہیں ہے کہ ان کے جد امجد حافظ محمد علی غزنی سے لاہور کب آئے۔لاہور میں وہ کسی شہزادہ کی تعلیم پر مقرر کیے گئے۔کچھ دنوں بعد شہزادہ تخت نشین ہوا تو مولوی صاحب کا خاندان بھی دہلی آ گیا اور شہزادگان کی تعلیم وتربیت پر مامور ہوا(۶)۔اینڈریوز لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب کی کم از کم چار نسلیں حافظ تھیں جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب کا خاندان شاہزادگان کو قرآن پاک کی تعلیم پر مامور رہا ہوگا(۷)۔مولوی ذکاء اللہ حافظ ثناء اللہ کے دوسرے فرزند تھے اور شاہی محل میں معلّمی کے عہدہ کے وارث تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم اسی نقطہ نظر سے ہوئی تھی(۸)۔مولوی ذکاء اللہ پر ان کے دادا حافظ بقاء اللہ کی تعلیمات کا بڑا اثر تھا۔بقول اینڈریوز، حافظ بقاء اللہ اسلامی ادب کے بڑے عالم تھے اور دہلی میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی(۹)۔ ذکاء اللہ کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان ہی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔دادا کی تربیت اور ان کی مذہب سے گہری وابستگی کا اثر ذکاء اللہ پر بھی پڑا جس سے ان کی کردار سازی ہوئی(۱۰)۔وہ تقویٰ اور علم کے ساتھ جوان ہوئے۔ان کے والدین بھی بے حد مذہبی تھے، ان کا بھی ذکاء اللہ کے کردار پر اثر پڑا(۱۱)۔لیکن ذکاء اللہ بقول اینڈریوز ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ان کے دادا نے ان پر اولین اور دائمی روحانی اثر چھوڑا تھا۔انہوں نے ذکاء اللہ سے کہا تھا کہ خدا کے وجود کو محسوس کرو۔اس طرح ان کی عبادتیں ایام طفلی سے ایک خاص کیفیت کی حامل تھیں(۱۲)۔ذکاء اللہ کی تعلیم وتربیت میں ان کی والدہ کا بھی بڑا حصہ تھا۔خودداری، سیر چشمی، صبر واستقلال ان کو ماں سے ملا تھا۔ذکاء اللہ کی والدہ نے افلاس کے باوجود بیٹے کی تعلیم وتربیت میں غفلت نہیں برتی اور ان کی تعلیم جاری

رکھنے کے لیے زیورات تک فروخت کردیئے (۱۳)۔ دہلی میں تعلیم کے حصول کے درمیان ذکاءاللہ دہلی کالج میں داخل کیے گئے۔ وہاں ان کے رفقاء میں مولوی نذیراحمد ان کے عزیز ساتھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ذکاءاللہ فارسی کے درجہ میں تھے اور وہ عربی کے، لیکن ریاضی کے درجہ میں دونوں ساتھ تھے جہاں ذکاءاللہ بہت ممتاز تھے (۱۴)۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے وہ ریاضی کے استاد پروفیسر رام چندر کے چہیتے شاگرد تھے۔ وہ کلاس میں ہمیشہ اول آتے۔ دہلی کالج میں مولوی نذیراحمد کے علاوہ ذکاءاللہ کے دیگر رفقاء میں مولوی کریم بخش، پیارے لال، چندولال، کنہیالال، میر ببرعلی اور ضیاءالدین قابل ذکر ہیں۔ (۱۵)

مولوی ذکاءاللہ کو عربی، فارسی کے مقابلہ میں علم ریاضی سے زیادہ رغبت تھی۔ پروفیسر رام چندر کی توجہ نے اسے اور جلا بخشی (۱۶)۔ سترہ سال کی عمر میں انہوں نے ریاضی پر پہلی کتاب شائع کی تھی۔ جس سے دہلی کے لوگوں کو بہت تعجب اور خوشی ہوئی کہ اس طالب علم میں ایسے جوہر ہیں۔ (۱۷)

مولوی ذکاءاللہ دہلی کالج سے تعلیم پوری کرنے کے بعد گوناگوں دشواریوں میں گھر گئے تھے۔ مالی دشواریوں سے مجبور ہوکر وہ حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ یہاں انہیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک انگریز معلم کی مدد سے انہوں نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کرکے انگریزی زبان پر قدرت حاصل کی لیکن بقول نذیراحمد وہ انگریزی زبان میں روانی سے گفتگو نہیں کرسکتے تھے۔ (۱۸)

ذکاءاللہ کے سامنے علم وادب کا سمندر تھا۔ وہ ایک پیاسے کی طرح اس سے سیراب ہونا چاہتے تھے۔ علم وفن پر ان کی تحریریں اس بات کی مظہر ہیں۔ بہرحال ہم اس مختصر مضمون میں صرف ان کی تاریخ نویسی، مذہبی اور قومی بصیرت پر گفتگو کریں گے۔

تاریخ نویسی کے متعلق ذکاءاللہ لکھتے ہیں: ''میرا قاعدہ ہے کہ میں مسلمان سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لیے وہ تاریخ لیتا ہوں جن کے مولف عہدنویس ہوں اور وہ سب سے بہتر اور معتبر سمجھی جاتی ہوں۔ ان سے تاریخی حالات اخذ کرکے لکھتا ہوں اور پھر انگریزی کتابوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے بعض مضامین التقاط کرکے لکھتا ہوں'' (۱۹)۔ گارسین دی تاسی

جو ان کے ہم عصر تھے رقم طراز ہیں کہ ''ذکاء اللہ کا طریقہ کار یکسر مغربی تھا اور اس لحاظ سے وہ ایشیائی مورخوں میں سب سے آگے تھے۔ ہر دورحکومت کے بارے میں انہوں نے اپنی ذاتی رائے کے بجائے انصاف پروری سے کام لیا اور تعصب کو کہیں پاس پھٹکنے نہیں دیا''۔ گارسین دی تاسی مزید لکھتے ہیں کہ ''ہمیں اس عالم کا احترام کرنا چاہیے جس نے انتہائی عرق ریزی کے بعد اپنے وطن کی مکمل تاریخ تیار کی اور ایک ایسی کمی پوری کی جو ہمارے ادب کی روح کی بے مائیگی پر نکتہ چیں تھی''۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ذکاء اللہ نے بقول پروفیسر اصغرعباس خردمندان مغرب کی حکمت کو اردو والوں کے لیے قابل فہم بنایا اور ہماری جدید علمی تاریخ میں روشن خیالی کی ایک نئی شان پیدا کی (۲۰)۔ ذکاء اللہ کی تاریخ نویسی میں معروضیت نمایاں ہے۔ وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان میں جنگوں کے ذکر میں مسلمان مورخین کی تواریخ سے استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''ان تاریخوں میں گو یک طرفہ بیان ہے مگر کہیں ان میں ایسا جھوٹ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اپنی شکست کو فتح میں لکھا ہو۔ مگر ہاں اپنی فتوحات کی صورت میں اپنی مردانگی اور فرزانگی کا بیان مبالغہ سے کیا ہے اور شکستوں کے ذکر میں عذرات ایسے کیے ہیں جن سے ان کی جواں مردی میں بٹہ نہ لگے۔ انسان کو بالطبع اپنی اہانت اور ہزیمت کے بیان سے نفرت ہے''۔ (۲۱)

مولوی ذکاء اللہ اورنگ زیب کے دورحکومت کے احوال میں اس کی مذہبی پالیسی پر کوئی پردہ نہیں ڈالتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں راجپوتانہ میں بت خانے منہدم ہوئے۔ ہندوؤں کے مقدس شہر بنارس میں بشیشور مندر اور نند مادھو کے مندر، متھرا کا کیشو رائے مندر مسمار ہوئے اور ان کی جگہ مساجد کی تعمیر ہوئیں ملتان میں بھی ایک مندر توڑا گیا۔ گنگا اور جمنا، سندھ کے کنارے جو ہندوؤں کی پرستش گاہیں تھیں، مسمار کی گئیں (۲۲)۔ ان منادر کے مسمار کیے جانے کا ذکاء اللہ کوئی عذر نہیں پیش کرتے جبکہ اورنگ زیب کے عہد پر ایک مبسوط کتاب کے تاریخ نگار آداب عالم گیری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں بہت سی مساجد کو شہید کر کے مندروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا (۲۳)۔ یہاں اورنگ زیب کا فرمان ۱۵/ جمادی الثانی ۱۰۶۹ھ، مطبوعہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۹۱۱، ص ۶۸۹ قابل توجہ

ہے۔اس فرمان میں اورنگ زیب نے ابوالحسن کو حکم دیا تھا کہ قدیم منادر مسمار نہ کیے جائیں اور نئے منادر تعمیر نہ کیے جائیں (۲۴)۔فرمان میں مزید ہدایت تھی کہ بعض افراد نفرت اور عداوت میں شہر بنارس کے ہندوؤں اور مندروں کے پجاریوں، نیز قرب و جوار کے بعض علاقوں کے پجاریوں کو پریشان کرتے تھے اور ان کو ان کے قدیم مناصب سے ہٹانا چاہتے تھے، ایسا نہ کیا جائے اور ان کے دینی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی انہیں پریشان کیا جائے تاکہ وہ لوگ سکون قلب کے ساتھ پوجا پاٹھ میں مصروف رہیں اور اس مملکت خداداد کی ترقی کے لیے دعا گو رہیں (۲۵)۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت کے آغاز ہی میں ایسی حکمت عملی کا اعلان کر دیا تھا کہ کسی بھی غیر مسلم کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ذکاء اللہ جو انگریزی داں بھی تھے اور یورپی مورخین کی اورنگ زیب کے متعلق آرا سے واقف تھے، رقم طراز ہیں: ''عیسائی مورخ اس کو متعصب کہتے ہیں اور جو کام اس کے ایسے ہیں کہ تعصب سے خالی ہیں اس کو مکروریا سے منسوب کرتے ہیں اور شیعہ مورخ عالم گیر کو سراپا مکروتزویر و باتدبیر بتلاتے ہیں اور عیسائی مورخ بھی ان کی تحریر کو زیادہ پسند کرتے ہیں (۲۶)۔سی۔ایف اینڈریوز ذکاءاللہ کی سوانح حیات میں انکشاف کرتے ہیں کہ انہوں نے دہلی کے قدیم ہندو باشندوں سے دریافت کیا تھا کہ مغلوں کے دور حکومت میں ان کے ساتھ کیسا سلوک رہا تھا۔انہوں نے بتلایا تھا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک رہا تھا اور مغلوں کے آخری دور حکومت تک ان کو حکومت سے کوئی شکوہ نہیں تھا (۲۷)۔اینڈریوز مزید لکھتے ہیں کہ بعد کے زمانہ میں عام امن وامان صدیوں کے روابط کا نتیجہ تھا اور مغل حکمرانوں کی قابل تعریف بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنے اندر مذہبی تعصب اور منافرت پر مکمل طور پر قابو پالیا تھا جس کی وجہ سے وہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کا سلوک اور غیر جانب دارانہ انصاف کرتے تھے۔(۲۸)

دور جدید کے ایک مقتدر مورخ، ذکاء اللہ آف دہلی کے مقدمہ میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اورنگ زیب کے جانشینوں کے متعلق ذکاءاللہ کا انداز ناقدانہ ہے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں وہ رطب اللسان اور ان کے کارناموں کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ کمپنی نے مشرق میں وحشیانہ حکومت کو ہٹا کر یورپ کی شان وشوکت اور ایک شائستہ ومہذب

حکومت قائم کی ۔ یہ نظریہ کسی حد تک درست ہے لیکن ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کے درمیان اقتدار کی جنگ میں خوں ریزی اور مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر دہلی اور قرب وجوار میں جاٹوں، سکھوں، مراٹھوں اور افغانوں کی لوٹ مار، قتل و غارت گری نے امن وامان اور عوام کے سکون کو درہم برہم کر دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور فوجی حکمت عملی سے اس بدامنی کو دور کیا تھا۔ ذکاء اللہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعریف ایک تاریخی غیر جانب دارانہ اعتراف حقیقت سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہند کی تصنیف ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات کے تقریباً بیس برس بعد کی تھی ۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز مورخین ایک حکمت عملی کے تحت تاریخ ہند میں نفرت اور فرقہ واریت کے بیج بور ہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے دوران ہندو مسلم فرقہ وارانہ مثالی ہم آہنگی نے انگریز حکمرانوں کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات کو ہوا دیں ۔ چنانچہ لارڈ الفنسٹن بمبئی کے گورنر نے ۱۴رمئی ۱۸۵۸ء کو لکھا تھا ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' قدیم رومن مقولہ ہے، اسے ہمیں اختیار کرنا چاہیے (۲۹) ۔ ۱۰رمئی ۱۸۶۲ء کو چارلس ووڈ نے ایلگین کو لکھا تھا ''ہم نے اپنی قوت کو ایک کو دوسرے کے خلاف لڑا کر برقرار رکھا تھا اور اسے ہمیں یقیناً جاری رکھنا چاہیے'' (۳۰) ۔ ایک دوسرے مراسلہ میں چارلس ووڈ لکھتا ہے ''ہندوستان میں ہم کوئی بھی پہلو اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ ہمیں یہاں کے باشندوں کے آپسی مناقشے پر بھروسہ کرنا چاہیے کیونکہ یہی ہماری قوت کا اہم پہلو ہے'' (۳۱) ۔ ہندوستان میں انگریز مورخین نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو تاریخی کتابیں لکھی ہیں اس میں اس پالیسی اور نظریہ کی جھلک ملتی ہے جس کا اظہار چارلس ووڈ ، الفنسٹن اور دوسروں نے اپنے سرکاری مراسلوں میں کیا ہے۔ اسی دور میں اورنگ زیب کی مذہبی حکمت عملی پر حملے شروع ہوئے کیونکہ وہ مغلوں کے عظیم بادشاہوں میں آخری تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریز مورخین کی تاریخ نگاری میں یہ عنصر تقریباً ناپید ہے چونکہ یہ ایک الگ موضوع ہے اس لیے ہم ذکاء اللہ ہی تک محدود رہیں گے۔ انہوں نے اس دور میں تاریخ ہند لکھی تھی ۔ وہ انگریزی حکومت کے مداح تھے لیکن تاریخ نویسی میں وہ عصبیت سے پاک نظر آتے ہیں ۔ تاریخی کتب میں اور عوام الناس میں مغل حکومت ،

حکمرانوں، بالخصوص اورنگ زیب کو جیسا انہوں نے پایا لکھا۔ باوجودیکہ وہ مغل دربار کے پروردہ تھے اور مغل حکمرانوں کے لیے وفاداری کے جو جذبات تھے وہ ان کی تحریر اور زندگی میں نظر آتے ہیں (۳۲)۔شاہ عالم ثانی کے متعلق ان کا تجزیہ قابل غور ہے''وہ بادشاہ تھا مگر بادشاہ نہ تھا۔ وہ کوئی چیز تھا مگر کوئی چیز نہ تھا وہ ایک ہی وقت میں اصلی اور مصنوعی نقل تھا۔ انگریزوں کو اس بازی میں یہ بڑی خاطر جمعی تھی کہ بادشاہ ان کے پاس تھا لیکن وہ ششدر اور متحیر اس میں تھے کہ بازی کیوں کر کھیلیں''۔(۳۳)

ذکاء اللہ انگریزی حکومت کی تعریف وتوصیف اس انداز میں کرتے ہیں جس سے ہجو کا پہلو نکلتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ کمپنی کی طرف سے بادشاہ اور ان کے کنبے کو بارہ لاکھ سالانہ ملتے تھے۔''اس طرح سے وہ شہنشاہ جو دنیا میں سب سے بڑا تھا تاجروں کی کمپنی کا پنشن خوار ہو گیا۔ اگرچہ اس سے برٹش گورنمنٹ کو بہت سے فائدے حاصل ہوئے لیکن وہ اندیشوں اور خرخشوں اور خوفوں سے خالی نہ تھے۔ اس مصیبت نے تنزل کی حالت میں بھی بادشاہ کا نام قوت کا ایک رکن اعظم تھا''(۳۴)۔

شاہ عالم ثانی کے عہد میں مغل حکومت بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ بادشاہ نام کا بادشاہ تھا۔ انگریز حکمراں اسے نام کا بادشاہ تصور کرتے تھے تاہم عوام اور ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کے یہاں اب بھی مغل بادشاہ حکمرانی کا سرچشمہ تھا۔ ذکاء اللہ وضاحت کرتے ہیں کہ زمانہ حال تک مغل حکمرانوں کے سکے چلتے تھے اور ہندوستان کے سلاطین خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو ہوں اپنے جانشینوں کے لیے برائے نام شاہی فرمان مانگتے تھے اور اس کو سرکار کمپنی کے فرمان سے زیادہ باوقعت و مستحکم جانتے تھے۔(۳۵)

ذکاء اللہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے چشم دید گواہ تھے۔ سرسید کی طرح ان کے گھرانے کی دربار شاہی سے وابستگی برقرار تھی۔ وہ بادشاہ اور دیگر شاہ زادگان کی حالت زار سے واقف تھے۔ دہلی پر مجاہدین آزادی کا قبضہ ہوا تو انہوں نے جبراً بہادر شاہ کو اپنی قیادت کے لیے مجبور کیا۔ بہادر شاہ نے چارو ناچار قیادت سنبھالی۔ ذکاء اللہ بادشاہ کے اقدام سے خوش نہ تھے۔ عروج سلطنت انگلشیہ لکھتے وقت غالباً وہ زبردست کشمکش کا شکار تھے۔ وہ کمپنی بہادر کی عمل داری

سے مطمئن تھے کہ امن وامان تھا اور انتظامیہ چست درست تھا۔لیکن ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پر مجاہدین آزادی کے تسلط کے بعد صورت حال بدل گئی ۔ بظاہر بہادر شاہ کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی تھی لیکن فوجیوں کے ساتھ کچھ شرپسند عناصر بھی آملے تھے۔جو لوٹ مار اور بدامنی کے ذمہ دار تھے۔ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ شہرت ہوگئی کہ مسلمانوں کی گئی گذری سلطنت پھر بحال ہوگئی۔باسی کڑہی میں اُبال آیا۔ان کا نقلی بادشاہ بہادر شاہ سچ مچ کا اصل بادشاہ ہوگیا جس کے دماغ میں نہ بادشاہ ہونے کی صلاحیت تھی نہ بادشاہی حاصل کرنے کے لیے کسی سے سازش کرنے کی قابلیت تھی ۔ اس نے چار ماہ چار روز تک ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء سے ۱۴رستمبر ۱۸۵۷ء فرماں روائی اس طرح کی کہ یہ امر تحقیق نہیں ہوا کہ اس کے دماغ میں یہ خبط سما گیا تھا کہ میں اپنے باپ دادا کی طرح ہندوستان کا بادشاہ ہوں یا باغی سپاہ کے ہاتھ کی کٹھ پتلی ہوں کہ جس ناچ چاہتے ہیں اسے نچاتے ہیں اور اس کو مقید رکھتے ہیں اور جو کام چاہتے ہیں وہ اس سے کراتے ہیں اس کا نام ومہر ودستخط وتحریر کو کام میں لاتے ہیں''۔(۳۶)

ذکاء اللہ کو انگریزوں اور ہندوستانیوں کی طاقت کا خوب اندازہ تھا باوجودیکہ یہاں وہاں ان کے قلم سے انگریزوں کی تعریف بھی ہوئی ہے تاہم وہ یہ کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بڑی عجیب بات یہ تھی کہ ہندوستانی ہی باغی تھے اور انگریزوں کی طرف سے ہندوستانی ہی اس بغاوت کو مٹانے والے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں''انگریز اپنا ایک کام تو بغیر ہندوستانیوں کی مدد کے کرنہیں سکتے تھے۔اگر اس وقت سارے ہندوستانی انگریزوں سے بیوفائی اور بغاوت کرتے تو انگریز ہندوستان میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتے تھے''۔(۳۷)

بہرحال مغلیہ سلطنت کے زوال کے آخری دنوں میں مغل بادشاہ بہادر شاہ کے لیے عوام میں جو جذبات تھے وہ ۱۲رمئی ۱۸۵۷ء کے شاہی جلوس میں چلتے ہوئے سینکڑوں دھوتی بند تلنگوں کے جوش سے ظاہر ہوتا ہے ۔ بادشاہ کی سواری کے آگے سارے بازار میں بہادر شاہ کی جئے پکارتے جاتے تھے اور اس کو دین دنیا کا گسیاں کہتے جاتے تھے۔(۳۸)

۱۸۵۷ء کے دوران دہلی کے علاوہ اودہ بھی متاثر تھا۔ذکاء اللہ صاف طور پر لکھتے ہیں کہ وہاں کی بغاوت کا سبب اودہ کا الحاق تھا جس کی وجہ سے عوام میں بددلی اور انگریزوں سے

نفرت پیدا ہوگئی تھی ۔ ذکاء اللہ کو علم تھا کہ بنگال کی فوج میں اودھ ، غیر اودھ اور انگریزوں کا کیا تناسب تھا۔ اودھ کے سپاہیوں کی بڑی تعداد بنگال کی فوج میں تھی ۔ انقلاب سلطنت اور اودھ کے الحاق کے سبب ان کے اندر انگریزوں سے نفرت اور کینہ پیدا ہوا تھا۔ اودھ کا شاہی خاندان موجود تھا اور اودھ کے امرا انگریزوں کی غاصبانہ حرکت سے بے زار اور برہم تھے ۔ ذکاء اللہ اودھ میں بغاوت کا ایک بڑا سبب ''انگریزوں کی قومی خصلت اور سیرت کی خودنمائی'' بتلاتے ہیں ۔(۳۹)

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو کچلنے کے لیے انگریزوں نے انسانیت کی تمام حدیں پار کردیں ۔ان کی شقاوت کا مظہر بہادر شاہ کے بیٹوں کا قتل ، دہلی میں خوں ریزی ، الٰہ آباد ، بنارس اور لکھنؤ میں عوام پر کیے گئے مظالم ہیں ۔ ذکاء اللہ انگریزوں کی اس حرکت کو ''حیوانی'' عمل قرار دیتے ہیں ۔(۴۰)

ذکاء اللہ نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ اسلامی تھا اور عصبیت سے پاک تھا۔ وہ بھی ایک سچے اور باعمل مسلمان تھے ۔ دہلی کالج میں دوران تعلیم وہ ماسٹر رام چندر کے بہت قریب آ گئے تھے ۔ رام چندر اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی بن گئے تھے ، اس لیے دہلی کے لوگ شک وشبہ کا شکار تھے کہ ذکاء اللہ بھی عیسائی ہو گئے تھے ۔ انڈریوز ذکاء اللہ کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ایک سچے موحد مسلمان تھے اور اسلام کے تمام ارکان پر عمل کرتے تھے (۴۱) ۔ مولوی نذیر احمد ذکاء اللہ کے مذہبی رجحان کی بابت لکھتے ہیں کہ وہ سچے مسلمان تھے لیکن ان کا اسلام مذہبی عصبیت کے جذبات سے دور تھا۔ وہ اپنی روزانہ کی زندگی میں ایک فرد کی تفریق مذہب کی بنا پر نہیں کرتے تھے ۔ سماجی طور پر وہ ہندو ، مسلمان ، عیسائی ، سب سے دل کھول کر ملتے جلتے تھے اور سماجی تعلقات میں مذہب کی تفریق نہیں کرتے تھے ۔(۴۲)

ذکاء اللہ نے مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی ادب پر بھی عبور حاصل کیا تھا تاکہ وہ ہندوستان میں ان ہندوستانیوں سے پیچھے نہ رہیں جو انگریزی ادب اور مغربی علوم سے آشنا تھے ۔ مغربی ادب اور علوم سے آگہی کے باوجود ذکاء اللہ نے اپنے اوپر مغربی تہذیب کے اثرات مسلط نہیں ہونے دیا۔ وہ حسب دستور اپنے رہن سہن ، کھانے پینے اور لباس میں قدیم ہندوستانی طور طریقوں پر قائم رہے (۴۳) ۔ بعد میں جب وہ سرسید کی تحریک سے وابستہ ہوئے تب بھی وہ اپنے مربی کے برخلاف ترکی ٹوپی ، انگریزی جوتوں اور کوٹ پتلون سے دور رہے ۔(۴۴)

امیر خسرو کی طرح ہندوستانیت ذکاء اللہ کے رگ و پے میں بسی تھی ۔ امیر خسرو نے ہندوستان کے متعلق جن خوب صورت جذبات کا اظہار کیا ہے وہ نہ سپہر کے اوراق میں محفوظ ہیں ۔ ذکاء اللہ نے اسی ہندوستانیت سے عشق کی وجہ سے ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ عاشقانہ خلوص کے ساتھ کیا۔ وہ اسی طرح ہندوستان کی سرزمین سے وابستہ تھے جیسے کوئی درخت زمین سے وابستہ ہوتا ہے ۔ اینڈریوز ذکاء اللہ کے فرزند کے حوالہ سے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک بار ذکاء اللہ نے اپنے والد سے اسپین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی جہاں کبھی ایک عظیم اسلامی حکومت قائم تھی ۔ ان کے والد کا جواب تھا کہ پہلے اپنے ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرو، جہاں کبھی تیمور کے جانشینوں بابر، اکبر اور شاہ جہاں کی عظیم مملکت تھی ۔ ان کے والد کی ہدایت تھی کہ پہلے اپنے ملک سے سچی محبت کرو اس کے بعد ہی تم دوسرے لوگوں کی تاریخ کو اچھی طرح سمجھ سکو گے (۴۵) ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ذکاء اللہ ہندوستانی تاریخ، شاعری اور موسیقی سب کو اہمیت دیتے تھے ۔ انہوں نے کبھی بھی کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا کہ کیا ہندو ہے اور کیا اسلامی، وہ ان تمام چیزوں پر فخر کرتے تھے کہ وہ سب ان کا اپنا ہے (۴۶) ۔ اسی لیے جب اینڈریوز نے ان سے پوچھا کہ ہندوستان میں اس وقت سب سے بڑی اہمیت کی چیز کیا ہے تو بغیر کسی پس و پیش کے ان کا جواب تھا ''مذہبی رواداری''۔ (۴۷)

ذکاء اللہ عربی النسل تھے لیکن انہوں نے اپنی تحریر میں اس پر فخر کا اظہار نہیں کیا ۔ ان کے اجداد کو ہندوستان میں آباد ہوئے سینکڑوں برس ہو چکے تھے ۔ ہندوستان ان کا ملک تھا ۔ وہ اس پر فخر کرتے تھے ۔ اینڈریوز سے ایک سوال کے جواب میں ذکاء اللہ نے جو جواب دیا وہ قابل توجہ ہے، انہوں نے کہا تھا کہ ''ہندوستان ہم سب کی مادر وطن ہے جس نے ہم کو جنم دیا، ہم لوگوں نے یہاں اپنے گھر بنا لیے ہیں، یہیں شادیاں کی ہیں اور بچے پیدا ہوئے ہیں ۔ اسی سرزمین ہند پر ہم نے اپنے بزرگوں کو دفن کیا ہے اس لیے دنیا میں یہی ہمارا سب سے پیارا ملک ہے، ہمیں اس سرزمین ہند سے پیار ہے جس میں ہمارے اجداد کی خاک ملی ہوئی ہے ۔ ایک ہزار سال سے ہمارا مذہب اسلام ہندوستان سے گہرے طور پر وابستہ ہے اور ہندوستان میں اسلام نے اپنے تمدن کی مخصوص ہیئت کی وجہ سے بعض اہم کامیابیاں حاصل کی ہیں ۔ ہمیں اس لیے ہندوستان کی تاریخ اور حکومت سے پیار رکھنا چاہیے جس کے خد و خال اکبر اعظم اور ان کے جانشینوں نے بنائے تھے ۔ مجھے یہ برداشت نہیں

ہے کہ گفتگو میں ہندوستانی مسلمان ہندوستان سے عقیدت کا، محبت کا اظہار نہ کریں، بدقسمتی سے اب یہ رجحان بڑھتا جارہا ہے جو میری جوانی کے دنوں میں ناپید تھا۔ یہ برا انداز ہے اور اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیے''۔ (۴۸)

ایک سچے مسلمان اور ہندوستانی ہونے کی وجہ سے وہ بیرون ہند آباد مسلمانوں کے سکھ دکھ کا خیال رکھنے کے حق میں تھے لیکن وہ اس کے خلاف تھے ہندوستانی مسلمان بیرون ملک کے مسلمانوں سے کوئی امید وابستہ رکھیں۔ (۴۹)

ذکاء اللہ کی تحریروں میں مشرقی روایات سے محبت اور لگاؤ کے ساتھ عصری تقاضوں کے تحت جدید نظریات بھی مل جاتے ہیں۔ ان کی قوم پرستی نام نہاد نہیں تھی۔ وہ خود قوم پرست تھے اس لیے وہ تمام ہندی مسلمانوں کو بھی ہندوستانی قوم پرست دیکھنا چاہتے تھے۔

مراجع

(۱) پروفیسر اصغر عباس نے یہ کتاب خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں دیکھی ہے جس کے سرورق پر مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ کتاب سرسید کی تحریک پر لکھی گئی تھی۔ (۲) سی۔ایف۔اینڈریوز، ذکاء اللہ آف دہلی، نئی دہلی ۲۰۰۹ء، ص ۴۹ (آیندہ بحوالہ اینڈریوز)۔ (۳) علی گڑھ میگزین، ۲۰۰۵ (اردو تنقید میں علی گڑھ کا حصہ)، ج ۱، ایڈیٹر محمد ارشد جمال، ص ۱۶۶۔ (۴) اینڈریوز، ص ۴۹۰۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً۔ (۸) ایضاً۔ (۹) ایضاً۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) ایضاً، ص ۵۰۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ایضاً، ص ۶۔ (۱۵) ایضاً، ص ۶۔ (۱۶) ایضاً، ص ۶۔ (۱۷) ایضاً، ص ۵۸۔ (۱۸) ایضاً، ص ۸۔ (۱۹) تاریخ ہندوستان (ظفر نامہ شاہ جہاں)، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۹۱۷ء، ص ۱۔ (۲۰) اصغر عباس، انتخاب ذکاء اللہ، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص ۹۔ (۲۱) تاریخ ہندوستان (اقبال نامہ)، ج ۵، علی گڑھ ۱۹۱۸ء، ص ۳۵۳۔ (۲۲) تاریخ ہندوستان، ج ۹، ص ۷۔ (۲۳) ظہیر الدین فاروقی، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، بمبئی، ۱۹۳۵، ص ۱۱۶۔ (۲۴) ایضاً، ص ۱۱۹۔ (۲۵) ایضاً، ص ۱۱۹۔ (۲۶) تاریخ ہند، ج ۹، ص ۸۔ (۲۷) اینڈریوز، ص ۲۷۔ (۲۸) ایضاً۔ (۲۹) بی۔ان۔پانڈے، اے سنیٹزی ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگریس، ج ۱، ۱۹۱۹-۱۸۸۵ء، ص ۶۹-۲۶۵۔ (۳۰) ایضاً۔ (۳۱) ایضاً۔ (۳۲) اینڈریوز، ص ۳۲۔ (۳۳) تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، ص ۳۶۳۔ (۳۴) ایضاً، ص ۳۶۶۔ (۳۵) ایضاً، ص ۳۶۵۔ (۳۶) ایضاً، ص ۳۶۴۔ (۳۷) ایضاً، ص ۶۵۹۔ (۳۸) ایضاً، ص ۱۷-۶۱۶۔ (۳۹) ایضاً، ص ۶۶۲۔ (۴۰) ایضاً، ص ۳۶۳۔ (۴۱) ایضاً، ص ۳۵۹۔ (۴۲) اینڈریوز، ص ۶۔ (۴۳) ایضاً، ص ۹۔ (۴۴) ایضاً، ص ۸۔ (۴۵) ایضاً۔ (۴۶) ایضاً، ص ۸۸۔ (۴۷) ایضاً۔ (۴۸) ایضاً، ص ۹۰۔ (۴۹) ایضاً، ص ۸۸-۸۷۔

حضرت مریمؑ کی افضلیت

جناب الیاس حسین

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز   از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

یعنی حضرت مریمؑ ایک نسبت سے علامہ اقبال کو عزیز ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ماں ہیں جبکہ حضرت فاطمہؓ انہیں تین نسبتوں سے عزیز ہیں، وہ رسول اللہؐ کی بیٹی ہیں، حضرت علیؓ کی بیوی ہیں اور حضرات حسنینؓ کی ماں ہیں۔

اگر علامہ کا یہ خیال ان کی اپنی ذاتی پسند یا رائے پر مبنی ہے تو ان کے اس خیال سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خیال اگر کسی مذہبی نظریے یا عقیدے کے طور پر ہے اور روایتی طور پر وہ حضرت فاطمہؓ کو دنیا کی سب خواتین پر افضلیت دینا چاہتے ہیں تو راقم ان کے اس خیال کو محل نظر اور قابل تفکر سمجھتا ہے کیوں کہ قرآن حکیم کی روشنی میں حضرت مریمؑ کی جو تصویر ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

۱-حضرت مریمؑ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ''صدیقۃ'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ عوام تو عوام، علماء اور دانشوروں نے بھی حضرت مریمؑ کو ارادی یا غیر ارادی طور پر صدیقہ کہنے کا التزام نہیں کیا نہ یہ غور کیا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے صدیقہ کے لقب سے یاد کیا اس کو صدیقہ کہنا بدرجۂ اتم ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے لقب کا احترام بہر حال ضروری ہے:

وَ اُمُّہٗ صِدِّیۡقَۃٌ کَانَا یَاۡکُلٰنِ الطَّعَامَ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُبَیِّنُ لَہُمُ الۡاٰیٰتِ ثُمَّ انۡظُرۡ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ (مائدہ:۷۵)

گرام شیخ پور، پوسٹ کمال گنج، ضلع فرخ آباد۔

۲- مریمؑ صدیقہ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق اور میوہ جات آسمان سے نازل کیے جاتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق رزق کا خاص ذریعہ اللہ تعالیٰ کی زمین، سمندر، اڑنے والے حلال پرندے اور چوپائے وغیرہ ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ موسم اور بے موسم کے میوہ جات اور کھانے جنت کی بہترین نعمتوں سے ہوں گے۔اس قسم کی نوازشیں اور عنایات دنیا کی کسی بھی خاتون کو عطا نہیں فرمائی گئیں ماسوا حضرت صدیقہ مریمؑ کے جو ان کی افضلیت کی کھلی نشانی ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (آل عمران:۳۷)

۳- اللہ تعالیٰ کا فرستادہ فرشتہ کنواری مریم صدیقہ کے پاس آیا اور ان کو کنواری عمر میں بغیر مسّ بشر ایک بچے (عیسیٰ) کی ماں ہونے کی بشارت دی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو دنیا میں کسی بھی دوسری خاتون کو عطا نہیں کیا گیا۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۔ (آل عمران:۴۷-۴۵)

۴- اللہ تعالیٰ نے اپنی روح اپنے فرستادہ فرشتے کے ذریعہ صدیقہ مریم میں پھونکی اور وہ حاملہ ہوگئیں۔ پیدائش کا یہ غیر رسمی اور نادر طریقہ کسی دوسری خاتون کو عطا نہیں فرمایا گیا جس کی کوئی نظیر نہیں۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِىْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (التحریم:۱۲)

۵- جب دردِ زہ صدیقہ مرؑیم کو ایک کھجور کے تنے کے نیچے لے آیا تو انہوں نے فرمایا کہ کاش وہ پہلے ہی مرگئی ہوتیں اور بھولی بسری شے (نَسْيًا مَّنْسِيًّا) ہو جاتیں لیکن ان کے نیچے (مِنْ تَحْتِهَا) سے آواز آئی کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہوں کیوں کہ ان کے رب نے ان کے پاؤں تلے چشمہ جاری کردیا ہے اور ان کے لیے کھجور کے درخت سے تازہ پکی ہوئی کھجوریں بھی گرائی گئیں۔

یہ آواز یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کی گئی یا پھر فرستادہ فرشتے کی طرف سے تھی۔ بہرکیف یہ مریم صدّیقہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی اعزاز ہے جس کی وجہ سے وہ خواتین عالم میں اس امتیاز کی مالک ہیں جس میں کوئی دوسری خاتون ان کی شریک نہیں۔

فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا وَ هُزِّیْٓ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا (سورہ مریم:۲۵-۲۴)

۶-حضرت مریم صدّیقہ اپنے بچے (حضرت عیسیٰؑ) کی پیدائش کے بعد ان کو گود میں لے کر اپنی بستی واپس تشریف لائیں تو لوگوں نے اس معصوم بچے کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرنا شروع کر دیے کیوں کہ ان کے خیال کے بموجب وہ کنواری عمر میں ایک بچے کی ماں ہوگئی تھیں جو ایک شریف اور اچھی شہرت رکھنے والی خاتون کے شایان شان نہ تھا۔ صدیقہ موصوفہ نے خود اس بارے میں کوئی صفائی پیش کرنے سے گریز کیا اور اپنی گود کے بچے کی طرف اشارہ فرمادیا یعنی یہ معصوم بچہ خود اپنی زبان سے اپنی ماں کے باعصمت ہونے کی تصدیق کرے گا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبر ہونے کا اعلان بھی کرے گا۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ (سورہ مریم:۳۲-۲۹)

۷-مریم صدّیقہ ایک ایسے پیغمبر کی ماں ہیں جن کو مسلمانوں کے عقیدے کے بموجب اب تک موت کا منہ نہیں دیکھنا پڑا اور وہ آسمان پر اٹھا لیے گئے جہاں وہ اب تک زندہ ہیں اور قرب قیامت پھر اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور موت کا ذائقہ چکھیں گے۔ یہ غیر معمولی عمل ایک پیغمبر کی ماں کے لیے بھی ایک بڑا اعزاز ہے جو دنیا میں کسی بھی ماں کو حاصل نہیں ہوسکا، سوائے حضرت مریم صدّیقہ کے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا۔ (سورۂ نسآء:۱۵۸-۱۵۷)

۸-حضرت مرؔیم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی عورتوں میں انتخاب کیا اور ان کو سب عورتوں پر افضلیت دی۔ یہ ایک اعزاز ہے جو دنیا میں کسی بھی خاتون کو حاصل نہ ہوسکا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے ایک خصوصی انعام ہے، نص قرآنی کی وجہ سے یہ مستند ترین بھی ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (آل عمران:۴۲)

۹-قرآن کریم میں حضرت مرؔیم کے نام سے اللہ تعالیٰ نے ایک سورہ نازل فرمائی ہے جس میں ان کا اور حضرت عیسیٰؑ کا تفصیلی ذکر ہے مزید آپ کا نام نامی قرآن پاک میں ۳۰ مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ اس طرح سے مریم صدّیقہ کا نام ہر تلاوت کرنے والے کی زبان پر آتا رہتا ہے۔ کیا یہ گراں قدر اعزاز دنیا کی کسی بھی دوسری خاتون کو حاصل ہے؟ موجودہ کرۂ ارض پر اچھی خاصی آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے، اس کے بعد دنیا میں تقریباً ۱/۵ حصہ مسلم آبادی کا ہے۔ دونوں مذاہب کے ماننے والے ان کو عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

۱۰- مریم صدّیقہ کا اللہ تعالیٰ کے فرستادہ فرشتے سے انتہائی جرأت آمیز انداز میں مکالمہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اوائل عمر سے ہی ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت عطا فرمائی تھی جیسا کہ قرآن پاک کی حسب ذیل آیات سے نمایاں ہے:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۔ (سورۂ مریم:۲۱-۱۷)

حضرت صدیقہ مرؔیم کی شخصیت صحیح احادیث کی روشنی میں بھی بڑی امتیازی شان سے جلوہ گر ہے۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں:

۱-حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے دن اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا اور ان کے کان میں کچھ سرگوشی فرمائی تو آپ (حضرت فاطمہؓ) آب دیدہ ہوگئیں پھر تھوڑے وقفہ کے بعد پیغمبرؐ نے کوئی دوسری بات فرمائی تو وہ ہنس پڑیں۔ جب رسول اللہؐ وفات

پا گئیں تو میں نے رونے اور پھر ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ اول پیغمبرؐ نے مجھ کو اپنے جلد انتقال ہونے کی خبر دی تو میں رو پڑی۔ اس کے بعد مجھ کو خبر دی کہ میں اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہوں گی سوائے مریمؑ بنت عمران کے تو میں ہنس پڑی۔ (ترمذی شریف، حدیث نمبر ۳۸۷۳)

۲- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ خواتین عالم میں بالترتیب چار خواتین بڑی فضیلت کی حامل ہیں: ۱- حضرت مریمؑ بنت عمران، ۲- حضرت خدیجہؓ بنت خویلد، ۳- حضرت فاطمہؓ بنت حضرت محمدؐ، ۴- حضرت آسیہؑ زوجہ فرعون مصر۔ (ترمذی شریف، حدیث نمبر ۳۸۷۸)

غور فرمایئے ترمذی شریف کی حدیث نمبر ۳۸۷۳ میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ جنت میں خواتین کی سردار ہوں گی سوائے مریمؑ بنت عمران کے یعنی اولیت کا درجہ مریمؑ صدیقہ ہی کو حاصل ہے، حدیث نمبر ۳۸۷۸ میں چار عزت مآب خواتین میں پہلا نام حضرت مریمؑ صدیقہ کا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں حضرت مریمؑ کی افضلیت کے اتنے واضح نصوص کی موجودگی کے باوجود ایسا کیوں احساس ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے مقام کے اعتراف میں کچھ کمی ہے۔ راقم کے خیال میں اس احساس کے پس پشت کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اہل بیت حضرات کی بے پناہ محبت اور حبّ اہل بیت کو ایمان کا درجہ دیا جانا، جہاں تک اہل بیت کی محبت اور ان کے احترام کا تعلق ہے وہ ہر مسلمان کے دل ودماغ کی عقیدت ہے اور بجا طور پر ہے لیکن اس میں ایسا مبالغہ جو قرآن پاک کی واضح نص کو بھی نظر انداز کردے درست نظر نہیں آتا قرآنی نصوص کی موجودگی میں ایسا کرنا بڑی جرأت کا کام ہے کیوں کہ یہ عمل قرآن کریم کے منشا کے خلاف نظر آتا ہے۔

اسلامی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کو بخوبی علم ہے کہ اموی وعباسی حکومتوں میں موضوع اور جعلی روایات کو احادیث رسولؐ کا درجہ دینے کی کوشش کی گئی اور کثرت سے یہ روایات احادیث کے نام سے پھیلا دی گئیں۔ ایسی حالت میں امت کے علماء ومحدثین نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے تحقیق حدیث کے اصول مرتب کیے اور ہر روایت کو اس کسوٹی پر نہایت امانت ودیانت سے

پر کھا لیکن اس غیر معمولی احتیاط کے باوجود چند روایات رائج و مقبول ہوتی گئیں حتی کہ اسلامی علوم میں سب سے زیادہ کام ''علوم اہل بیت'' پر ہوا جو تقریباً ۷۰ فیصد ہے۔ اس کے بعد احادیث نبویؐ کا نمبر آتا ہے جو کل لٹریچر کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ ہے۔ سب سے کم کام علوم قرآن پر ہوا ہے یعنی محض ۱۰ فیصد۔

میرے نزدیک علامہ اقبال بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر اسی عام عقیدت کی رو میں آ گئے اور ان کی زبان سے فارسی کا وہ شعر نکل گیا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ حضرت مریمؑ انہیں ایک نسبت سے عزیز ہیں جبکہ حضرت فاطمہؓ تین نسبت سے عزیز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نظریات اور شاعری کی بنیاد قرآن پاک کی تعلیم پر رکھی اور تارک قرآن کی تنقیص کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے جواب شکوہ میں فرمایا کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

(اقبال۔ جواب شکوہ۔ بانگ درا)

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت مریمؑ صدیقہ کا تعلق عیسوی دور سے ہے۔ اس قسم کی تفریق پر ایمان رکھنے والوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کا دین ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے جس کی سب رسولوں نے تبلیغ کی۔ لیکن شریعتوں میں اس وقت کے سماجی اور تہذیبی ماحول کے پیش نظر جزوی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہ ایک فطری اور ارتقائی عمل ہے۔ دین کے ایک ہونے کی بات قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہے جیسا کہ حسب ذیل آیات قرآنی سے ظاہر ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۔ (یونس: ۴۷)	یعنی ہر امت کے لیے رسول ہے۔
لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ۔ (المائدہ : ۴۸)	یعنی تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے دستور اور منہاج (راہ) مقرر کر دی۔
اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۔ (الانبیاء : ۹۲)	یہ تمہاری امت ہے جو (حقیقت میں) ایک ہی امت ہے۔ میں تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔

بخاری کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں۔ ہمارا دین ایک ہے۔اس سلسلہ میں یہ آیت بھی بڑی اہم ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ (شوریٰ:۱۳)	یعنی تمہارے لیے دین کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا اور ہم نے تمہاری طرف وحی کی جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین کو ٹھیک رکھو اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (ترجمہ فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں صاحب)

ان آیات اور احادیث کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ دین حضرت آدمؑ کے وقت سے ایک ہی ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک میں اللہ تعالیٰ کے رسول آتے رہے مگر ان کی شریعتوں میں جزوی تبدیلی ہوتی رہی اور آخر میں محمد رسول اللہؐ کی بعثت پر شریعت کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا دین عیسوی بھی اپنے دور کا اسلام ہی تھا اور حضرت عیسیٰؑ پیغمبر اسلام تھے۔حضرت مریمؑ ایک مسلمہ ،صالحہ اور مومنہ خاتون تھیں بالکل اسی طرح جس طرح کوئی خاتون بعثت نبویؐ کے دور میں ایمان لانے کے بعد ہوسکتی ہے۔

میں اختلاف حدیث کے رموز سے زیادہ آشنا نہیں لیکن ایک حدیث کو جس طرح مختلف مکاتب فکر نے محل استدلال بتایا ہے اس پر حیرت ضروری ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

۱- اصل حدیث: لوگو! میں تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم اس پر عامل رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ ہے کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم۔

۲- اہل تشیع کا موقف: اے مومنو! میں تمہارے لیے دو بھاری چیزیں (ثقلین) چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم ان پر عامل رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ ہے کتاب اللہ یعنی قرآن اور دوسرے میرے اہل بیت۔

۳- اہل حدیث کا موقف: اے لوگو! میں تمہارے لیے دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ پہلی

کتاب اللہ یعنی قرآن اور دوسری میری سنت۔

۴- بریلوی موقف : اے لوگو! میں تمہارے درمیان تین چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ پہلی کتاب اللہ یعنی قرآن، دوسری میری سنت اور اہل بیت ان سے غافل نہ رہنا۔

اہل علم وفن حضرات ان چار آراء میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں کہ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان آراء و مکاتب فکر (گروہوں) کا وجود اور ان کی اپنی ترجیحات آج بھی برقرار ہیں جن میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور ساتھ ہی پوری شدت کے ساتھ آپس میں محاذ آرائی بھی ہے۔ تشریح و بیان کا دامن یقیناً وسیع ہے لیکن اصل نقطہ سے انحراف نہ مطلوب ہے نہ مستحسن، ذیل میں مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی مرحوم معروف عالم دین ومصنف ومولف کی مشہور کتاب ''قاموس القرآن'' کے ایک نوٹ کا اقتباس جو حضرت مریمؑ پر ہے پیش کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''تحقیق یہ ہے کہ یہاں مریمؑ کی فضیلت جزوی مراد ہے جو بغیر مس بشر عیسیٰؑ جیسا بیٹا پاکر حاصل ہوئی جس کا ذکر متصلاً واقع ہے۔ اس اعتبار سے وہ تمام عورتوں سے افضل ہیں اور دیگر اعتبار سے وہ بنی اسرائیل کی تمام عورتوں سے تو افضل ہیں ہی''۔ (قاموس القرآن، ص۴۹۲، طبع چہارم مکتبہ قاضی منزل۔ قاضی اسٹریٹ میرٹھ)

اس اقتباس میں محترم قاضی صاحب نے بغیر کسی حوالے کے ایک حدیث بھی تحریر فرمائی ہے۔

"الحمد لله الذی جعلك یا بنية شبيهة النساء بسيدة نساء بنی اسرائيل " ۔	تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اے بیٹی تجھے بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار مریم کے مشابہ بنایا۔

حضرت قاضی صاحب نے ایک بےحوالہ روایت کا سہارا لے کر قرآن حکیم کے ایک واضح بیان کو نظرانداز کرتے ہوئے حضرت مریمؑ کی قرآنی افضلیت کو جزوی فضیلت میں تبدیل کردیا۔

اخبار علمیہ

عالم اسلام کے وزرائے ثقافت کی جانب سے ہر سال کسی ایک شہر کو اسلامی تہذیب و ثقافت کا حامل شہر قرار دیا جاتا ہے جس کے بعد اس شہر منتخب کے ذمہ داروں پر اس اعزاز کو جشن میں بدلنے کی ذمہ داری آجاتی ہے یعنی اس شہر کے تاریخی مقامات، ثقافتی مراکز اور عوامی امتیاز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کیے جاتے ہیں، ۲۰۰۳ء میں مکۃ المکرّمہ کو عالم اسلام کے ثقافتی شہر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا اور اب تقریباً دس برس بعد مدینہ منورہ کا انتخاب کیا گیا ہے، عربی روزنامہ ''الوطن'' کے مطابق اس ضمن میں مدینہ منورہ کے تاریخی اور ثقافتی مقامات پر جامع معلومات تیار کی جائیں گی، زائرین کو تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کرائی جائے گی، عالم اسلام کے وزراء کی آٹھویں کانفرنس مدینہ میں ہوگی، مدینہ کے گورنر شہزادہ عبدالعزیز بن ماجد کا کہنا ہے کہ ۲۰۱۳ء کے اس اعزاز کو ہم تاریخی یادگار کے طور پر منانا چاہتے ہیں مرکز المدینۃ المنورۃ للدراسات والبحوث کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل عبدالباسط بدران کا کہنا ہے کہ تقریباً ساڑھے چودہ صدی گزرنے کے بعد مدینہ منورہ کی تاریخ کے متعلق تحقیقات میں تشنگی ہے، مدینہ کے کم از کم چار سو تاریخی و تہذیبی مقامات ایسے ہیں جن سے عام سیاح اور زائر بھی ناواقف ہے اور اکثر محققین بھی ان سے بےخبر ہیں، اس موقع پر ان مقامات کی اہمیت بھی واضح ہوگی۔

اسلامی ملکوں کی سب سے بڑی نمائندہ تنظیم او آئی سی ۲۵ ستمبر ۱۹۶۹ء کو مراکش کے شہر رباط میں وجود میں آئی، کچھ عرصہ قبل اس کا نام اسلامک کانفرنس سے او آئی سی یعنی آرگنائیزیشن آف اسلامک کنٹریز کر دیا گیا ہے، اس کے وجود کی اصل محرک ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ تھی جس نے مسلم ممالک کو ان کے حقوق کے تحفظ اور ان کی آواز کو عالمی سطح تک پہنچانے کے لیے ایک بااثر ادارہ کے قیام کی ضرورت کا احساس دلایا، بعد میں اس کے دائرہ کار میں سائنسی، تہذیبی اور معاشرتی شعبوں میں تعاون کو فروغ دینا بھی شامل کیا گیا، اس تنظیم نے انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانوں کو سرکاری درجہ دے رکھا ہے، اس کے ممبر ممالک کی کل آبادی ڈیڑھ ارب کے قریب ہے، اب تک اس

کے گیارہ سربراہی اجلاس منعقد کیے جاچکے ہیں، اسی سال ۲۸ سے ۳۰ جون کی تاریخوں میں اس کے ممبر ملکوں کے ۳۸ وزرائے خارجہ کا اجلاس قزاقستان کے شہر آستانہ میں ہوا جس میں مصر، لیبیا، تونس، یمن، شام وغیرہ کے مندوبین نے اہم قراردادوں پر دستخط کیے، تنظیم کے سربراہ اکمل الدین اوغلو نے کہا کہ ملت اسلامیہ بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے، اس وقت اس کو بہترین انتظامیہ، سیاسی اشتراک اور قومی مذاکراتی عمل کی سخت ضرورت ہے تاکہ قانون کی حکمرانی اور انسانی حقوق کی پاسداری کی راہ ہموار ہوسکے۔

اس خطۂ ارض پر آباد ممالک کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۶ ہے جن کے بارے میں لوگ عام طور پر واقف ہیں لیکن کچھ ملک ایسے ہیں جو بہت چھوٹے ہیں، آزادی اور خود انتظامی رکھتے ہیں لیکن غیر معروف ہیں، ان میں ''کوموروس'' کا جزیرہ بھی ہے، جس کا سرکاری نام ''یونین آف کوموروس'' ہے، یہ افریقہ کے مشرقی ساحل پر موزمبیق اور مڈغاسکر کے درمیان واقع ہے، دارالحکومت کا نام ''موروتی'' ہے، کوموروس عربی لفظ ''قمر'' سے ماخوذ ہے، یہ متنوع تہذیبوں کا سنگم ہے، یہاں پولیس کی تعداد ۵۰۰ ہے اور اتنی ہی تعداد دفاعی فوج کی بھی ہے، آبادی کا بیشتر حصہ زراعت اور ماہی گیری کے پیشہ سے وابستہ ہے، پورے ملک میں صرف ایک اخبار شائع ہوتا ہے، ریڈیو کوموروس سروس اور کوموروس نیشنل ٹی وی سروس بھی ہے، عصری اسکولوں میں تعلیم سے قبل کسی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے، اساتذہ کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور قسط وار ملتی ہیں، ۱۹۷۵ء میں اس ملک نے فرانس سے آزادی حاصل کی، قریب ۸ لاکھ کی آبادی میں بے روزگاری کی شرح چودہ فیصد ہے۔

چند برس قبل ایک خاتون امینہ ودود نے نیویارک میں نماز جمعہ کی امامت اور شریعت کے عطا و عاید کردہ نسائی حقوق و واجبات کی غلط تشریح کر کے ہنگامہ پیدا کردیا تھا، اب خبر آئی ہے کہ ہائی لینڈ کی راجدھانی ایمسٹرڈم میں ایک ایسی مسجد کا افتتاح کیا گیا ہے جس میں صرف عورتیں نماز پڑھیں گی، اس کا افتتاح مصر کی ایک خاتون ادیبہ نول السعداوی نے کیا جس پر مصر ہی کی ایک عدالت میں ارتداد کا مقدمہ بھی درج کیا گیا ہے، مصر میں مخالفت کی وجہ سے وہ ہالینڈ چلی گئی، اس

نے اپنے خطبہ میں مردوں کی بالا دستی کے خلاف آواز بلند کی دوسری طرف مصر کے مفتی اعظم علی جمعہ سے عورت کی امامت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ نمازی چاہیں تو عورت کو امام بنا سکتے ہیں، عورت کی امامت پر اتفاق رائے نہیں ہے، اس لیے اس کی گنجائش ہے، یہ دلیل بھی دی کہ امام طبرانی کے نزدیک عورت کی امامت جائز ہے، تنظیم اسلامی کے جنرل سکریٹری نے ان خبروں کے متعلق کہا کہ گہری سازش کے تحت اسلام دشمن اس قسم کی حرکتوں کی حوصلہ افزائی کر کے مسلمانوں کی توجہ اسلام کے حقیقی مسائل سے ہٹانا چاہتے ہیں، ہالینڈ کی ۱۸ملین کی آبادی میں مسلمان ایک ملین کے قریب ہیں، زیادہ تر ترکی اور مراکش سے ہیں، ۴۵۰ مسجدیں اور ایک ہزار کے قریب اسلامی ادارے ہیں۔

امریکہ کے سنٹر برائے سائنس مفاد عامہ کی جانب سے جاری کردہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کیا رامل نامی کیمیکل کولا مشروبات میں استعمال کیا جاتا ہے جو صحت کے لیے نقصان دہ ہی نہیں بلکہ اس کے مستقل استعمال سے کینسر کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، یہ کیمیکل شکر سے تیار کیا جاتا ہے، شکر کے علاوہ اس میں امونیا بھی شامل ہے، حیوانات پر تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امونیا انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ سائنس سے وابستہ محققین نے ایف بی آئی سے درخواست کی ہے کہ وہ ان تمام کیمیاوی اشیاء پر پابندی عائد کرے جو مشروبات میں استعمال ہوتے ہیں لیکن صحت کے لیے مضر ہیں۔

گلوبل لینگویج مانیٹر کے مطابق ایریزونا یونیورسٹی کے ماہرین موسمیات نے جب گرد آلود آندھی اور تیز طوفانی ہوا کے لیے عربی لفظ ''ھــــبــــوب'' استعمال کیا تو اس پر اعتراضات شروع ہو گئے، جواب میں جی ایل ایم کے ماہر لفظیات جے جے پائک نے کہا کہ الکحل، الجبرا، کیمسٹری، گٹار، زیرو سمیت وغیرہ سینکڑوں عربی کے الفاظ ہیں جو انگریزی میں استعمال کیے جاتے ہیں اور دوسری زبانوں کے بیشمار الفاظ اور انگریزی میں شامل اور رائج ہیں، ان سب کے بارے میں غور کرنا ہوگا اور ''ھبوب'' کا لفظ تو انگریزی میں ۱۹ویں صدی سے استعمال ہوتا رہا ہے۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

تفسیر جلالین

۶/ جولائی ۲۰۱۱ء
مئوناتھ بھنجن

گرامی قدر محترم مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی صاحب، حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔ معارف (شمارہ جون ۲۰۱۱ء) میں محترم ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کے مقالہ ''تفسیر ترجمان القرآن'' پر چند اشکالات کے ضمن میں ''تفسیر جلالین'' سے متعلق جس اشتباہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ محل نظر ہے۔ یہ مراسلہ اسی سے متعلق ہے، محترم ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''جہاں تک ''تفسیر جلالین'' کا تعلق ہے، یہ جلال الدین محلی اور جلال الدین سیوطی کی مشترک تصنیف ہے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا حصہ کس نے لکھا ہے''۔ (ص ۴۵۷)

معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب موصوف کو یہ تردد تفسیر جلالین کے براہ راست مطالعہ کے باوجود ہے یا یہ دیدہ نہیں محض شنیدہ ہے، ورنہ مقدمۃ الکتاب میں تفسیر سورہ بقرہ کے آغاز ہی میں یہ وضاحت وصراحت موجود ہے کہ آیندہ تفسیر از سورہ بقرہ تا آخر سورہ اسراء امام محلی کی تفسیر نہیں ہے بلکہ یہ حصہ یعنی تفسیر جلالین کا نصف اول از بقرہ تا آخر سورہ اسراء، امام سیوطی کا ہے اور نصف ثانی از کہف تا آخر قرآن امام محلی کی تالیف کردہ تفسیر ہے، پھر اس امر کی وضاحت وصراحت سورہ اسراء کی تفسیر کے خاتمہ میں مکرر کی گئی ہے، میں ذیل میں مقدمہ اور خاتمہ کی عبارتیں نقل کرتا ہوں، مقدمہ کی عبارت یہ ہے:

''امـا بعد ، فهذا ، اشتدت اليه حاجة	اما بعد، یہ تفسیر از سورۂ بقرہ تا آخر سورۂ اسراء
الـراغبيـن فـى تـكـملة تفسير القرآن	امام محقق مدقق علامہ جلال الدین محمد بن احمد محلی
الـكـريـم الـذى الـفـه الامام العلامـه	شافعی کی تالیف کردہ تفسیر قرآن کریم کا تکملہ
الـمحقق المدقق جلال الدين محمد	ہے جس کی راغبین کو شدید حاجت تھی، اور یہ
بـن احـمـد الـمحلى الشافعى وتتميم	امام محلی کے مافات - باقی ماندہ - جو اول

مـافـاتـه وهو من اول سورة البقرة الى آخر سورة الاسراء بتتمة على نمطه ۔	سورہ بقرہ سے آخر سورۂ اسراء تک ہے کا اتمام ہے، ایسا تتمہ وتکملہ جو امام محلی ہی کے طرز پر ہے۔

خاتمۂ تفسیر سورہ اسراء کی عبارت یہ ہے:

قال مولفه هذا آخر ماكملت به تفسير القرآن العظيم الذى الفه الامام العلامه المحقق جلال الدين المحلى الشافعیؒ ۔	اس کا مولف کہتا ہے یہ اس تکملہ کا آخری حصہ ہے جس سے امام علامہ محقق جلال الدین محلی شافعی کی تالیف کردہ تفسیر قرآن عظیم مکمل ہوجاتی ہے۔ (آخر تفسیر سورۂ اسراء، ص ۲۴۰)

ظاہر ہے یہ دونوں عبارتیں امام جلال الدین محلی کی تو نہیں ہیں بلکہ امام سیوطی ہی کی ہیں۔ اس لیے وہی اس حصہ بقرہ تا اسراء کی تفسیر کے مولف ہیں اور دوسرے حصہ کہف تا آخر قرآن کی تفسیر کے مولف امام محلی ہیں، کیا ان دونوں عبارتوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بھی کسی کو وہ اشتباہ وتردد ہونا چاہیے جو ڈاکٹر صاحب موصوف کو ہوا ہے۔ بہرحال یہ واضح اور متعین ہے کہ تفسیر جلالین کے نصف ثانی کے مولف امام جلال الدین محلی (۷۹۱ھ/۸۶۴ھ) ہیں، ان کے بعد ان کے شاگرد امام جلال الدین سیوطی (۸۴۹ھ/۹۱۱ھ) نے اس کا تکملہ نصف اول بقرہ تا اسراء کی تفسیر لکھ کر اتمام وتکمیل فرمایا۔

امام محلی نے قرآن کریم کے نصف ثانی کی تفسیر پہلے لکھی اس کی وجہ جو بھی رہی ہو، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ تھا کہ نصف اول کی تفسیر بھی لکھیں گے، چنانچہ اس کا آغاز بھی کردیا تھا اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی بھی لیکن کسی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا یا زندگی نے مہلت نہ دی اور یہ حصہ باقی رہ گیا اور اس کی تکمیل امام سیوطی نے کی، چونکہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر امام محلی ہی کی لکھی ہوئی ہے، اسی لیے اسے سورۃ الناس کی تفسیر کے بعد آخر میں ملحق رکھا گیا، اول قرآن میں نہیں رکھا گیا تاکہ اس کے امام سیوطی کی تفسیر کا حصہ ہونے کا شبہ نہ ہو۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب موصوف نے امام بیضاوی کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ صاحب کشاف (علامہ زمخشریؒ) کے معتزلی عقائد سے متاثر نظر آتے ہیں، یہ بھی محل نظر ہے، امام بیضاوی شافعی، اشعری مکتب فکر کے نمایندہ ہیں، انہوں نے اپنی تفسیر میں علامہ زمخشری کے تفسیر کشاف میں داخل کردہ معتزلی افکار وعقائد کے رد یا اس سے احتراز کا اہتمام کیا ہے، دور جانے کی ضرورت نہیں نمونہ کے طور پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ''الرحمٰن الرحیم'' کا معنی ومقتضی جو صفحہ ۷ پر ہے اور سورہ بقرہ کی تفسیر کے شروع ہی میں ''رزق'' کا معنی جو صفحہ ۱۹ پر ہے دیکھا جاسکتا ہے۔

(مولانا) محفوظ الرحمٰن فیضی

انسداد غلامی

مدرسۃ الاصلاح،
سرائے میر، اعظم گڈھ
۲۷/ جولائی ۲۰۱۱ء

مدیر محترم، سلام مسنون

معارف جولائی ۲۰۱۱ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج کا مقالہ ''انسداد غلامی میں قرآن کا کردار'' پڑھا، بہت پسند آیا۔ بڑا معلوماتی اور پرمغز مقالہ ہے۔ یہ مقالہ نو نکات پر مشتمل ہے۔ موصوف اس جرأت مندانہ اظہار خیال پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ لیکن مقالہ کے دو نکات محل نظر ہیں:

۱- قانون مکاتبت کا روایتی مفہوم قرآنی مفہوم سے مختلف ہے۔

۲- باندیوں سے نکاح کے بغیر جنسی تمتع کرنا خلاف قرآن ہے۔

ان میں سے پہلے نکتہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے موصوف نے تحریر فرمایا ہے:

''مکاتبت کی یہ شرط کہ غلام یا باندی اپنے آقا کو مال لاکر دے اور اس کے عوض رہائی حاصل کرے، کم از کم قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں تو اس کے برعکس حکم دیا گیا ہے یعنی مالکوں کو کہا گیا ہے کہ اس مال میں سے دو جو خداوند عالم نے تمہیں دیا ہے۔ پس مکاتبت کا یہ مشروط مفہوم خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوسکتا''۔ (ص ۹)

پروفیسر موصوف نے اپنی دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ ۔ (النور:۳۳)	اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو مکاتب ہونا چاہیں تو انہیں مکاتب کردو۔ اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو اور تم (مکاتب کرتے وقت) انہیں اللہ کے مال میں سے دو، جو اس نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

فاضل مقالہ نگار کا یہ انوکھا نکتہ کئی پہلوؤں سے حیرت ناک ہے۔

(الف) آیت زیر بحث جس سیاق میں آئی ہے اس میں اسلامی معاشرہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ہدایات دی جارہی ہیں۔ یہ معاشرتی ہدایات بعض آیات میں نبی کریمؐ کو مخاطب بنا کر دی جارہی ہیں کیونکہ آپؐ کی حیثیت سربراہ معاشرہ اور وکیل قوم کی ہے تو گویا ان آیات میں مسلم معاشرہ کو آپؐ

کے توسط سے مخاطب بنایا جا رہا ہے ۔ اور بعض آیات میں براہ راست مسلم سماج کے سرکردہ افراد کو مخاطب بنایا جا رہا ہے جیسا کہ آیت زیر بحث میں بھی ہے ۔

اس آیت پر نظر ڈالیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ مسلم سماج کے سرکردہ افراد سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام غلامی کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا اس لیے اس کے خاتمہ کی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں ۔ ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اگر تمہارے اندر کے غلام یا باندی مکاتب ہونا چاہیں اور تم ان کے اندر یہ صلاحیت پاؤ کہ وہ عمدہ آزاد زندگی گزار سکتے ہیں تو تم انہیں مکاتب بننے کا موقع فراہم کرو، اس سلسلہ میں مالی امداد کی ضرورت بھی پیش آئے تو تم اس سے دریغ نہ کرو ۔ اپنی گردن سے طوق غلامی اتارنے والوں کی مدد کرنا تمہارا فرض ہے ۔ مالی امداد میں سب سے اہم چیز مکاتبت میں متعینہ رقوم کی فراہمی ہے ۔

اس پوری آیت میں خطاب مسلم سماج کے سرکردہ افراد سے ہے ۔ خود فاضل مقالہ نگار نے بھی ''کم'' ''کاتبو'' اور ''علمتم'' کا مخاطب مسلم معاشرہ کے انہی افراد کو مانا ہے لیکن پتہ نہیں کیسے اور کس بلاغی نکتہ اور ضرورت کے تحت '' آتو '' کا مخاطب مکاتبت چاہنے والے غلاموں کے آقاؤں کو قرار دے دیا ہے جبکہ اس آیت میں مخاطب کی اس تبدیلی کا نہ تو سیاق میں کوئی قرینہ ہے اور نہ الفاظ میں ۔ اس کے باوجود موصوف نے اپنے خیال کو قرآنی خیال جب کہ دیگر مفسرین اور علماء کی رائے کو غیر قرآنی قرار دیا ہے ۔

(ب) کتاب یا مکاتبت ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ '' کوئی غلام اپنے آقا سے اس بات کا خواہاں ہو کہ وہ فلاں مدت کے اندر اس کو اتنی رقم یا اس کی کوئی معین خدمت انجام دے گا یا اس کے کام کی تکمیل کر دے گا جس کے بعد آقا اس کو آزاد کر دے گا '' ۔ کتاب یا مکاتبت کا یہی مفہوم عام طور سے علمائے امت نے بیان کیا ہے لیکن فاضل مقالہ نگار کے نزدیک '' کتاب '' یا '' مکاتبت '' مشروط ہے محض صلاحیت سے ۔ یعنی جس کے اندر آزادی کی صلاحیت ہو اسے مکاتب بنا دیا جائے ۔

لیکن سوال یہ ہے کہ پھر تحریر رقبة اور فك رقبة کیا چیز ہے؟ اگر تحریر رقبة ، فك رقبة اور کتاب و مکاتبة بہ لحاظ اثرات و نتائج ایک ہی ہیں اور نوعیت بھی ان کی ایک ہی ہے تو اس اصطلاح کی کیا اہمیت باقی رہتی ہے؟ اور پھر شرط اہلیت و صلاحیت کی کیا معنویت ہے؟ جب کہ مکاتبت کے علاوہ کسی اور لفظ کے ساتھ اہلیت و صلاحیت کی شرط نہیں ہے ۔

(ج) اگر فاضل مقالہ نگار کے مفہوم کو قرآنی مان بھی لیا جائے تو انسداد غلامی کی کون سی نئی راہ کھل جاتی ہے جو ابھی تک بند رہی ہے اور اگر دیگر علماء کے مفہوم کو درست سمجھا جائے تو غلامی کے خاتمہ

کی کون سی راہ بند ہو جاتی ہے؟

(د) رہی یہ بات کہ ''مکاتبت کے بیان کردہ روایتی مفہوم میں مالک کا کردار استحصالی دکھائی دیتا ہے''۔ (ص۱۰) تو ماننا پڑے گا کہ مال کے بدلے رہائی اور آزادی کا تصور استحصالی ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے تو اس آیت کی کیا توجیہ ہوگی جس میں فرمایا گیا ہے: فاما منا بعد واما فداء (محمد:۴) جس کا ترجمہ خود فاضل مقالہ نگار نے یہ کیا ہے کہ ''پھر اس کے بعد (حسب حالات) یا تو انہیں احساناً چھوڑ دو یا فدیہ لے کر آزاد کردو'' (ص۱۲)۔ موصوف کا یہ ترجمہ ملاحظہ کیجیے پھر بتائیے کہ کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آزادی کے عوض مال لینے کی خدائی اجازت ہے؟ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ مسلم کا استحصال تو جائز نہیں ہے لیکن غیر مسلم کا استحصال جائز ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

۲- فاضل مقالہ نگار کا جو دوسرا نکتہ محل نظر ہے وہ یہ ہے کہ باندیوں سے نکاح کے بغیر جنسی تمتع کرنا خلاف قرآن ہے۔ سورۃ المومنون کی ابتدائی سات آیات ملاحظہ فرمائیے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ۔

ان آیات میں ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ'' پر نظر ڈالیے اور بتائیے کہ اگر آقا باندی سے نکاح کرلے تو اب وہ باندی رہ جائے گی یا بیوی ہو جائے گی؟ اگر باندی رہ جائے گی تو نکاح کا کیا مطلب؟ اور اگر بیوی ہو جائے گی تو ''ازواجھم'' میں شامل ہوگئی پھر یہ ''ما ملکت ایمانھم'' کون ہیں جن سے جنسی تمتع میں قرآن کے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں؟ ٹھیک انہی لفظوں میں یہ دونوں آیات سورۃ المعارج: ۲۹، ۳۰ میں بھی ہیں۔

واقعاتی طور سے بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ ماریہ قبطیہؓ اللہ کے رسولؐ کی باندی تھیں اور ان سے آپؐ کا نکاح کم از کم میرے علم کی حد تک ثابت نہیں، لیکن ان سے آپؐ کا جنسی تعلق ثابت ہے، جس کا ثبوت حضرت ابراہیمؓ ہیں۔ اب اگر (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ ہی منشائے قرآن نہیں سمجھتے تھے تو کون سمجھے گا؟ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اس لیے یہ کہہ کر بھی نہیں ٹالا جاسکتا کہ محض اخبار آحاد کی بنیاد پر ثابت کسی واقعہ کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ والسلام (مولانا) **محمد عمر اسلم اصلاحی**

وفیات

پروفیسر عبدالقوی دسنوی مرحوم

افسوس، پروفیسر عبدالقوی دسنوی اس دنیا سے رخصت ہوئے، انا للّٰہ انا الیہ راجعون۔ ۷؍جولائی کو وہ بھوپال کی خاک میں آسودہ خواب ہوئے تو اردو کی دنیا صرف ایک شریف، متین اور نشیط صاحب قلم سے ہی محروم نہیں ہوئی، ایسے مخلص، فعال بلکہ مجاہد انسان کو کھو بیٹھی جس کا تعلق اس جنس سے تھا جس کو اب نایاب ہی کہا جا سکتا ہے۔

دیسنہ ان کا وطن تھا، سادات کا یہ گاؤں بہار کیا پورے ہندوستان میں ممتاز اور منفرد تھا کہ اکثر باشندوں نے تعلیم قدیم و جدید دونوں کو یکساں اہمیت دی۔ کم ایسی بستیاں ہیں جن کی خاک سے مولانا سید سلیمان ندوی، سید ابوظفر ندوی، سید نجیب اشرف ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن جیسی شخصیتیں اٹھیں اور علم و قلم کے بادل بن کر ملک کے مختلف خطوں کو سیراب کر گئیں۔

پروفیسر عبدالقوی بھی اسی سلسلہ ابر وسحاب کا ایک حصہ تھے، بچپن، وطن میں ضرور گزرا جہاں مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم کا آغاز ہوا، ۴۲ء میں وہ آرہ کے ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں تھے لیکن پھر وہ بمبئی آگئے جہاں ان کے والد پروفیسر سید سعید رضا ندوی درس و تدریس کی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے، قوی صاحب نے بمبئی کے مشہور سینٹ زیویر اسکول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، بمبئی گویا وطن ثانی تھا لیکن قدرت نے ان کے لیے بھوپال دارالاقبال کی سرزمین اس طرح مقدر کی کہ ۶۱ء میں سیفیہ کالج کے شعبہ اردو کی ایک خالی جگہ کے لیے ایک درخواست اور اس کی قبولیت نے ان کو ''بھوپال والے عبدالقوی دسنوی'' بنا دیا، بمبئی کے ہنگامہ خیز اور پرشور ماحول سے نکلے تو کوہساروں، بیابانوں کے نشیب وفراز اور ان کے دامن میں بکھرے زندگی کے تازہ و شاداب جلوؤں اور پرسکون ماحول کو پاکر محسوس کیا کہ ''دیرینہ آرزو'' پوری ہوئی، ان کے الفاظ میں اس دیرینہ آرزو کی شرح تو نہیں ہوئی لیکن عملی طور پر یہ ضرور ظاہر ہوئی کہ انہوں نے اردو اور اس

کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کے لیے یقیناً کسی نقشے، راستے اور منزل کا تعین کیا تھا، سیفیہ کالج اس کا ذریعہ بنا، سیفیہ کالج اور اس کا شعبہ اردو ظاہر ہے کوئی انوکھا اور جدا نہیں تھا، بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور ان کے شعبہ ہائے اردو کی چمک دمک کے سامنے مقامی کالجوں کے دیوں کی بساط ہی کیا لیکن قوی صاحب کے عزم اور حوصلے نے وہ کر دکھایا جس کی توقع بھی عموماً نہیں کی جاتی، دیکھتے دیکھتے سیفیہ کالج کی شہرت اس کے شعبۂ اردو کی بلند پروازیوں سے پورے ملک میں اس طرح پھیلی کہ اس کے خاص نمبروں، اس کی ادبی تقریبات اور اس کے ہونہار طالب علموں کا نام اور کام اہل نظر کی نظر میں آ گیا اور ان ساری فتوحات کے پس منظر میں قوی صاحب کے خون جگر کی سرخی دمکتی رہی، ایسا نہیں کہ حالات ہر طرح مساعد و معاون تھے، خود قوی صاحب نے لکھا کہ برسوں وہ خود کو اس طرح اجنبی محسوس کرتے رہے کہ نہ تو جذبات کے اظہار کا یارا تھا اور نہ اپنے محسوسات و نظریات کو کھل کر بیان کرنے کا حوصلہ تھا، لیکن فرض کو فرض سمجھ کر اس کو ادا کرنے کی ہمت تھی کہ آہستہ آہستہ راہیں ہموار ہوتی گئیں اور ایسے لوگ جو اپنے مفادات سے مجبور ہو کر راستے کی رکاوٹ بنتے ہیں، الجھنے اور الجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ آتے رہے اور ناکام و نامراد بھی ہوتے رہے۔ قوی صاحب کی فطری شرافت اس کریمانہ روش پر قائم رہی، جس کی سب سے بڑی خوبی لغو سے اعراض ہے، وہ اپنے ذمہ داروں کے لیے مخلص اور اپنے طلبہ کے لیے مشفق رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا شعبہ اردو ہر پہلو سے کامیابی کی ان منزلوں سے ہم کنار ہوا کہ گویا شعبہ اردو ہی سیفیہ کالج ہو گیا، حقیقت یہی ہے کہ اس شعبے نے سائنس، آرٹس اور کامرس کے دوسرے شعبوں کو مہمیز کیا جس کی وجہ سے ایک وقت اس کو ہندوستان کا سب سے اچھا اقلیتی کالج قرار دیا گیا۔ اس کامیابی میں قوی صاحب کا بڑا حصہ رہا اور اس کا اعتراف بھی کیا گیا، یہاں تک پروفیسر شبیہ الحسن نے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبہ تھے ایک موقع پر کہا کہ "سیفیہ کالج کے شعبہ اردو کو دیکھ کر میں نے سبق حاصل کیا کہ شعبہ کو کس طرح ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچایا جاتا ہے، عبدالقوی دسنوی صاحب اپنی تحریروں میں صاحب اسلوب ہیں مگر وہ حسن انتظام اور ذوق اہتمام میں بھی قابل تقلید اسلوب کے مالک ہیں"۔

قوی صاحب اور سیفیہ کالج ایسا موضوع ہے جو بڑا تفصیل طلب ہے، جہاں چمن میں ہر طرف کسی ایک کی داستاں اور طرز فغاں بکھری ہو اس کو سمیٹنے کے لیے وقت چاہیے۔ حیرت ہوتی

ہے کہ تعلیم اور تنظیم کی ہمہ وقت مصروف زندگی سے قوی صاحب کس طرح تحریر و تحقیق کے لیے وقت نکال لیتے تھے، لکھنے کا شوق تو تھا ہی، بھوپال آنے سے پہلے ان کا پہلا مضمون علی گڑھ کے سہ ماہی اردو ادب میں چھپا جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ لسان الصدق کے متعلق تھا، خدا جانے یہ ابتدا کس مبارک ساعت میں ہوئی کہ ان کی تصنیفی و تالیفی زندگی پر مولانا آزاد ہی سایہ فگن رہے، مضامین لسان الصدق، مطالعہ غبار خاطر، ماہنامہ لسان الصدق، یادگار آزاد، تلاش آزاد، ابوالکلام آزاد، ابوالکلام محی الدین آزاد، ہفتہ وار پیغام، معاصرین ومتعلقات آزاد، جواہر آزاد جیسی کتابیں ساہتیہ اکادمی، مکتبہ جامعہ، خدا بخش لائبریری، نسیم بک ڈپو اور یوپی، بہار، مہاراشٹر کی اردو اکادمیوں کی جانب سے شائع ہوتی رہیں، مولانا آزاد سے ان کے تعلق و تاثر کی وجہ تھی کہ ان کی نظر میں مولانا بے غرضی کی تصویر، بے باکی کے پیکر، جری، بے باک، محبِّ وطن اور قومی اتحاد کے شیدائی تھے، ان کی علمی و ادبی عبقریت ان سب پر مستزاد، اسی عقیدت نے ان کو جب سینئر فیلوشپ دلائی تو انہوں نے اس احساس کے ساتھ کہ اب تک جامع ترین سوانح آزاد مرتب نہیں ہوئے انہوں نے حیات ابوالکلام آزاد کو بڑے اہتمام سے مرتب کر کے شائع کیا، ۹۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب واقعی ذخیرہ ابوالکلامیات میں موقر اضافہ ہے جس کے پانچ ابواب میں مولانا آزاد کی زندگی کا گویا ہر رخ سامنے آ گیا، مولانا آزاد کے سوانح میں علامہ شبلی کا ذکر تو آتا ہے لیکن دارالمصنّفین سے مولانا آزاد کے دیرینہ اور مسلسل تعلق کی داستانیں کم سنائی جاتی ہیں، اس کتاب سے یہ تشنگی بھی دور ہوئی، ۲۰۰۰ء میں چھپی یہ کتاب دسنوی صاحب کے تصنیفی سفر کی معراج ہے، اتنی ضخیم کتاب کی اشاعت کے مصارف ان کے صاحب زادے علی نواز دسنوی نے برداشت کیے تو شفیق باپ نے ان کو یہی دعا دی کہ وہ اچھے انسان اچھے ہندوستانی اور اچھے مسلمان بننے میں کامیاب ہوں، یہ دعا ان کی اولاد حقیقی کے ساتھ اولاد معنوی کے لیے بھی رہی، ان کے شاگرد بے شمار ہوئے اور قابل فخر شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں، مظفر حنفی، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، پروفیسر خالد محمود، اقبال مسعود ندوی، جاوید اختر، یعقوب یاور، غفران اعظم، اسلم شیر وغیرہ کی کامیابیوں میں قوی صاحب کی تربیت اور دعاؤں کی برکت کا بڑا اثر ہے۔

قوی صاحب کی کامیابی میں سب سے بڑا جذبہ اردو سے ان کی محبت کا ہے، بھوپال

کے ریاست سے پردیش ہونے کا عمل، تہذیبوں اور زبانوں کے تصادم جیسا تھا، کل تک جو شہر اردو تہذیب وتمدن کا مرکز اور شعر وادب کا گہوارہ تھا اور جہاں بقول راجیند رسنگھ بیدی ''آئے بغیر اردو کا ادیب صیقل نہیں ہوسکتا'' ملک کے دوسرے اردو مراکز کی طرح یہاں بھی اردو کشی کا خطرہ اور خدشہ تھا، قوی صاحب کے سامنے یہ حقیقت تھی اسی لیے وہ اس شہر اقبال کی عظمت کو اردو کے حوالے سے حتی المقدور قائم رکھنا چاہتے تھے، ان کی ایک کتاب ''میں اردو ہوں'' اردو سے ان کی محبت کا بڑا موثر نقش ہے، انہوں نے ہماری زبان دہلی اور دوسرے رسائل میں مسلسل اردو کے مسائل پر اظہار خیال کیا کہ اردو والے اپنی زبان کی اہمیت اور اس کی خدمت اور موجودہ حالت سے باخبر رہ کر لسانی طور پر باعزت رہیں۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق ہمیشہ اخلاص کا رہا، حضرت سید صاحب اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور شہاب الدین دسنوی کے رشتوں نے اس کو مزید تقویت دی، حضرت سید صاحب کی صدسالہ تقریبات پیدائش کے موقع پر بہار اردو اکادمی نے سید صاحب کی حیات وخدمات پر ایک مفصل اشاریہ کی ضرورت محسوس کی تو اس اہم ذمہ داری کے لیے قوی صاحب سے درخواست کی گئی، اشاریہ سازی میں غیر معمولی مطالعہ کے ساتھ تحقیقی صلاحیت بھی مطلوب ہے، قوی صاحب کو یہ خوبی بھی ودیعت ہوئی تھی، انہوں نے غالب صدی میں ''غالبیات'' اور جشن انیس کے موقع پر ''انیس نما''، پریم چند صدی میں دھنپت رائے نواب رائے پریم چند اور اقبال صدی کی مناسبت سے ''ہندوستان میں اقبالیات'' جیسے کارآمد اور پرازمعلومات اشاریے تیار کیے تھے، سید صاحب پر اشاریے کی درخواست تو ان کے دل کی آواز اور اس کی تیاری ان کے لیے بمنزلہ سعادت تھی، یہ اشاریہ انہوں نے بڑی محنت سے تیار کیا اور یہ یادگار سلیمان کے نام سے شائع ہوا۔ حضرت سید صاحب پر مولانا محمد عمران خاں ندویؒ نے تاج المساجد بھوپال میں ۸۵ء میں ایک پروقار اور یادگار سمینار کیا، اس موقع پر قوی صاحب ہر لحہ مولانا ندوی کے ساتھ تعاون میں پیش پیش رہے، سید صاحب اور بھوپال کے تعلق سے مقالہ بھی پیش کیا، اسی سال نواب سلطان جہاں بیگم کا قصر سلطانی جہاں ریاست کے آخری حکمراں نواب حمیداللہ خاں کی ساری زندگی گزری، جہاں علامہ شبلی نے دارالمصنفین اور سیرۃ النبی کے منصوبوں سے سلطان جہاں بیگم کو

واقف کرایا، جہاں علامہ اقبال اور سر راس مسعود نے اپنے قیمتی شب و روز گزارے وہی قصر سلطانی، سیفیہ کالج کا باقاعدہ حصہ بنا، سمینار کے مندوبین کے اعزاز میں وہاں عشائیہ کا اہتمام تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تقریر و تاثرات نے اس عشائیہ کو ناقابل فراموش بنادیا اور اس کا سہرا صرف قوی صاحب کے سر رہا۔

گذشتہ سال بھوپال کا سفر ہوا تو برادر محترم پروفیسر حسان خاں کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ایک طویل بیماری کے بعد وہ کمزور نظر آئے لیکن گفتگو میں دل نشینی اور محبت کی چاشنی پہلے جیسی تھی اس سال ۹؍جولائی کو مولانا محمد عمران خاں ندویؒ صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے بھوپال میں ایک نشست تھی، دارالمصنّفین کے مشاہیر کے خطوط بنام مولانا محمد عمران خاں کی رسم اجراء بھی تھی، خیال تھا کہ عبدالقوی صاحب سے ملاقات ہوگی اگر ان کو نشیط دیکھوں گا تو عرض کروں گا کہ حضرت یہ سید صباح الدین صاحب کی صد سالہ یاددہانی کا بھی سال ہے، ان کی نہایت قابل قدر علمی، تاریخی، ادبی خدمات کا بھی کچھ حساب ہوجائے، لیکن کیا خبر تھی کہ وہ صرف دو روز پہلے اس دنیا سے رخصت ہوجائیں گے، سینٹ زیویر سے سیفیہ اور سیفیہ سے قصر سلطانی تک عروج کی داستان، ملاء اعلی سے لقاء پر مکمل ہوئی۔ ایک نہایت شائستہ اطوار، نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہستی کا نیستی ہونا واقعی بڑا نقصان ہے، نقصان کا یہ احساس اور سوا ہوجاتا ہے جب دل یہ کہتا ہے کہ اب یہ شکلیں نہ دکھائے گا زمانہ ہرگز

اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم

پروفیسر امیر حسن عابدی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا غم کم نہ تھا کہ جناب شرف الدین اصلاحی کے سانحہ ارتحال کی خبر دارالمصنّفین اور پوری علمی دنیا کو سوگوار کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اعظم گڈھ کی مردم خیز سرزمین سے اٹھے، ان کا مولد موضع سنجر پور ہے، مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کی، مدرسۃ الاصلاح کو اپنے جن فرزندوں پر ناز ہے

اور یہ تعداد میں کم نہیں، ان میں ایک یقیناً شرف الدین اصلاحی مرحوم بھی تھے، الاصلاح کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والوں نے اس کے مختلف ادوار تقسیم کیے ہیں، اس میں عہد زریں کی نمایندگی کرنے والوں میں بھی اصلاحی مرحوم کا نام شامل ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اصلاحیوں میں ان کی ذہانت سب سے نمایاں تھی۔

سنجر پور اور اعظم گڈھ کے اس لائق فرزند کو گردش روزگار نے پاکستان پہنچا دیا، کراچی میں رہ کر اصلاحی مرحوم کی ذہانت کے ساتھ ان کی مشکل پسند طبیعت کا بھی ظہور اس طرح ہوا کہ انہوں نے لسانیات کے موضوع پر تحقیق کے لیے سندھی زبان کا انتخاب کیا، سندھی زبان سیکھی اور ذرا سی مدت میں اردو سندھی کے روابط کے رموز و اسرار فاش کرنے کے لائق ہو گئے، پی ایچ ڈی کے لیے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خواہش و فرمائش، اصلاحی صاحب کے لیے سخت آزمائش تھی، بقول ان کے ''لسانیات میرا خاص مضمون نہ تھا اور سندھی سے میں ناآشنائے محض تھا، اس حالت میں اردو سندھی کے لسانی روابط پر تحقیقی کام کا بیڑا اٹھانا بڑی جسارت کی بات تھی'' اصل بات یہ ہے کہ وہ چیلنجوں پر یقین کرنے والے تھے اور اپنی ہمت و محنت سے وہ بار عظیم کو اٹھانے میں کامیاب بھی ہوتے تھے، ہم ان کی زندگی سے زیادہ واقف نہیں لیکن ان کی ہمت و حوصلہ کی داستانیں کچھ سنی ہیں اور بعض چیزوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے، مشاہدہ کی توفیق اس وقت ہوئی جب اصلاحی صاحب ذکر فراہیؒ اور فکر فراہیؒ کی تالیف کے سلسلے میں دارالمصنّفین تشریف لائے اور کئی سال تک برابر ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، اس وقت ان کی کتاب اردو سندھی کے لسانی روابط پاکستان کی مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہو چکی تھی اور وہ غالباً اس وقت اسلام آباد کے موقر مجلّہ فکر ونظر کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حالات کی تلاش و تحقیق میں وہ جس طرح روز و شب ایک کرتے اور راستوں اور مسافتوں کو قطع کرتے رہے، وہ جذبہ ہمارے لیے حیرت انگیز تھا، ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان کی جانب سے ان کو یہ فراہی پروجیکٹ ملا اور اس شرط پر کہ یہ مدت صرف ایک سال کی ہوگی، اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے محض ایک سال کی یہ مدت یا تو اس کام کی اہمیت سے اغماض تھا یا پھر واقعی کوہ کن کی آزمائش تھی، کوئی اور ہوتا تو یا تو انکار کرتا یا پھر ایک سال میں خانہ پری کر کے مطمئن

ہو جاتا لیکن شرف الدین مرحوم کی عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا وہ مسلسل کئی سال اپنے خرچ پر ہندوستان آئے اور دہلی سے کلکتہ تک جہاں جہاں کوئی نقش فراہی نظر آیا، تحقیق کی پیشانی خم کردی، دارالمصنّفین بہرحال ان کی اس تحقیقی سرگرمی کا مرکز تھا، ۸۲ء کے بین الاقوامی اسلام اور مستشرقین سمینار میں بھی انہوں نے اپنا پرمغز مقالہ بعنوان ''مستشرقین، استشراق اور اسلام'' پیش کیا، ان کے قافلے میں ان کے ادارے کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے علاوہ ڈاکٹر محمود احمد غازی، احمد خاں، حافظ محمد طفیل بھی موجود تھے، اس سمینار کی روداد بھی بڑے دلچسپ انداز میں لکھی، معارف میں ان کے چند اور مضامین بھی شائع ہوئے جیسے عہد نبوی میں اسلامی ریاست کا نظام تعلیم، اردو زبان وادب میں قرآنی الفاظ کا استعمال وغیرہ، کچھ مضامین جو مولانا فراہیؒ کے تعلق سے ہیں وہ ذکر فراہی کی تحقیق وتدوین کے دور میں لکھے گئے، اصلاً ذکر فراہی وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے شرف الدین مرحوم ہمیشہ زندہ رہیں گے، اس کتاب میں انہوں نے جس طرح گاؤں گاؤں جا کر روایتوں کی سماعت کی پھر ان کی صداقت وثقاہت کے دلائل تلاش کیے، بقول شخصے اس سے علم رجال میں محدثین کی محنت کے واقعات پر یقین آ گیا، لیکن اس سے زیادہ کرب وآزمائش سے وہ اس کتاب کی طباعت کے دوران گزرے، آزمائش ہی نہیں صدمے تھے، اتنے کہ ان ہی کے الفاظ میں ''میرا کمال یہی ہے کہ اب تک زندہ ہوں'' تفصیل ذکر فراہی کے دیباچے میں ہے، نسخہ ہائے وفا کی اس تالیف میں اپنوں کی بے وفائی اور سردمہری سے ان کے دل پہ جو گزری اس کی کہانی وہ کچھ بیان کر گئے لیکن واقعتاً ان کا دل ودماغ جن اذیتوں سے گزرا یقین ہے کہ اب اس کے بدلہ میں راحتیں ان کے ساتھ ہوں گی۔

شہرت اور عزت سے وہ ہم کنار ہوئے لیکن یہ ان کی طبعی شرافت تھی کہ وہ اپنے سے بہت چھوٹوں سے بھی اس محبت سے ملتے کہ خود بخود اپنے بڑے کا احساس ہونے لگتا، باتیں کرتے اور خوب کرتے اور ہم ان کی معصومیت، سادگی اور بھولے پن کو دیکھتے رہ جاتے، عرصے سے ان کی کوئی خبر نہیں تھی، اب جو خبر ملی تو اس طرح، کاش کوئی ان کے حالات تفصیل سے لکھ دے، معلوم تو ہو کہ دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے، مغفرت کرے کہ بہرحال آزاد مرد تھے۔

پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی مرحوم

۲۶؍ جولائی کے اخبار میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے انتقال کی خبر کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی کی وفات کی بھی خبر تھی، غم دوگنا ہوگیا، دنیائے علم کی ویرانی سی ویرانی ہے، اس کیفیت خزاں میں شجر زندگی کے اوراق زرد ہوتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شیراز ہند جونپور کے مردم خیز قصبہ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے، الہ آباد اور علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، معاشیات کے موضوع میں اختصاص کیا، پہلے مسلم یونیورسٹی اور بعد میں سعودی عرب کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی میں اسی کا درس دیا، اللہ نے قلب وذہن کو پاکیزگی بخشی، اسلام کے نظریۂ معاشیات کو عصری نظام سرمایہ داری اور قمار وسود کی گرم بازاری میں یقین واعتماد کے ساتھ پیش کر کے اس کی بہتری اور برتری ثابت کرنا، اس دور کا فرض کفایہ تھا جس کو پورا کرنے والوں میں فریدی مرحوم کا حصہ بڑا نمایاں ہے۔ تدریس کے ساتھ انہوں نے تصنیف وتالیف کا عمل جاری رکھا، جماعت اسلامی سے متاثر تھے اسی لیے جماعت کے انگریزی ترجمان ''ریڈینس'' کی ادارت اور دوسری انتظامی ذمہ داریاں بھی وقتاً فوقتاً انجام دیتے رہے، لیکن رسالہ ''زندگی نو'' ان کے افکار ونظریات کا سب سے موثر ترجمان رہا، وہ اس کے مدیر تھے اور اشارات میں ان کی ادارتی تحریریں اشارات سے زیادہ بینات کی صورت سامنے آتی رہیں۔ خصوصاً معاشی موضوعات پر ان کی تحریریں نہایت معلومات افزا ہوتیں، ان کے افکار کی تہہ میں صرف یہ جذبہ پنہاں ہوتا کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کی برکتوں کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانہ کا ماحول سب سے سازگار ہے لیکن ہماری معلومات صرف روایتی مذہبی تعلیمات تک محدود ہیں، آئی ایم ایف جیسے مالیاتی اداروں کو ان کے اسلوب میں بتانے کی ضرورت ہے کہ قرضوں کی معیشت کے بالمقابل وہی معشیت مناسب ہے جس میں سرمایہ کاری کرنے والے اور تجارت اور استثمار کرنے والے دونوں شریک ہوتے ہیں، ایسے مسائل میں یہ پیغام بھی شامل رہتا کہ سرمایۂ حیات، سود سے کہیں فزوں تر ہے، افسوس اب یہ نوائے درد خاموش ہوگئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ع-ص

مطبوعات جدیدہ

غالب اور بدایوں: از ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ نئی دہلی-۲۔

غالب کے اس شعر کی ضمیر خدا جانے کس کی طرف راجع تھی مگر خود غالب کے لیے یہ سوفی صد صحیح ہے کہ ان کی ہر بات بلائے جان رہی، ان کے عہد میں ان کے لیے اور اب تک ان کے معتقدین و منتقدین کے لیے بھی، کلام، فلسفہ، شعر، نثر اور خود ان کی شخصیت کے بے شمار پہلو اور ہر پہلو بجائے خود دلکش! آہ وفغاں کے علاوہ بستی و بیاباں کے لحاظ سے مقامات اور بھی ہیں، حضر وسفر واثر کے ان مقامات جیسے دلی، بھوپال، بنگال، باندہ، الہ آباد، بنارس، میرٹھ، مارہرہ، علی گڑھ، رام پور وغیرہ میں غالب کے نقش قدم وقلم کی تلاش جاری رہی اور اب زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی توسیع کی ایک اور خوبصورت شکل میں سامنے آئی ہے، قبۃ الاسلام بدایوں، قبہ شعر وادب بھی رہا، سالار مسعود غازی سے شجاع الدولہ تک اسی بستی نے عروج وزوال کے مختلف رنگ دیکھے، لیکن ادب وشعر کی تاثیر اس کی فضا سے کبھی جدا نہیں ہوئی، غالب خود اس شہر میں نہیں آسکے لیکن موج نفس قریب سے بہر حال گزری اور اس طرح کہ اس کو ''گہرے تعلق'' سے تعبیر کیا گیا، فاضل محقق اسی مردم خیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے ذوق تحقیق کو غالب سے جلا ملتی تھی، یہ کتاب اسی ذوق کی عمدہ تصویر ہے جس میں غالب کے عہد میں بدایوں میں ان کی مدح وقدح کی داستان اور ان کے تلامذہ سے مراسلت کا سراغ ہے، عہد غالب کے بعد بھی بدایوں کی غالب شناسی اور ادب بدایوں پر غالب کے اثرات کا جائزہ اس طرح لیا گیا کہ مومن، نظامی، سحر، تسلیم، فانی سے آل احمد سرور اور حنیف نقوی تک رہ گذر غالب کا ہر چراغ روشن ہوگیا، خود مصنف کا ذکر بھی مقطع کی روایت کی تکمیل کرتا نظر آتا ہے، تحقیق کی امانت اور تنقید کی صداقت ان کی شناخت ہے، اظہار رائے میں ان کی جرأت ان کے مطالعہ وتجزیہ کو واقعی پروقار بناتی ہے، چنانچہ وہ بڑی وضاحت سے کہہ جاتے ہیں کہ بدایوں کے شعر وادب پر مورخانہ نظر ڈالی نہیں گئی اس لیے غالب کے اثرات کی نشان دہی دشوار طلب ہے، یوں بھی عہد غالب میں غالب کا رنگ سخن، بدایوں میں نامقبول ہی رہا، کچھ اثر ہے تو سحر وتسلیم کے کلام میں ہے اور مصنف نے سلیقے سے ایسے اشعار پیش کر دیے، ماہرین غالبیات

کی بدایوں کے تعلق سے تحقیق پر نقد و جرح اور رد و قبول اس کتاب کی امتیازی شان ہے، مالک رام اور حنیف نقوی جیسے دو اہم محققوں سے اختلاف و اتفاق جس سلیقے سے اس کتاب میں ہے اس سے لائق مصنف کی خود اعتمادی کی غمازی ہوتی ہے، خود اپنے چند گذشتہ بیانوں سے بھی انہوں نے ایمان داری سے رجوع کیا ہے، مختصر تبصرے میں ساری باتیں نہیں آسکتیں لیکن نظامی بدایونی اور غالب کا باب جس میں دیوان غالب کے نسخہ بدایوں اور اس کے نظامی ایڈیشن اور نظامی پریس کی خدمات کا ذکر ہے، نہایت معلومات افزا ہے، نظام الدین حسین نظامی بدایونی کی خدمات اس لائق ہیں کہ اردو ادب عالیہ میں ان کا احترام سے مطالعہ کیا جائے، اسی طرح بدایوں کے حکیم غلام نجف خاں، غالب کے ایک اہم مکتوب الیہ ہیں، ان کے ایک اور ہم نام سے کچھ غالب شناسوں کو التباس ہوا، لائق مصنف نے اسے رفع کرتے ہوئے، غلام نجف خاں کے احوال تفصیل سے دیئے، غالبیات میں بدایونی اہل قلم کی نگارشات کا اشاریہ بھی بڑی افادیت کا حامل ہے، غرض یہ کہنا محض ادائے رسم نہیں کہ یہ کتاب غالبیات کے ذخیرے میں عمدہ اضافہ اور خود محقق کی تحقیقی صلاحیت کا خوب صورت اشاریہ ہے، ''البتہ عمائدین، اکابرین، ممکن ہوسکا''، کے استعمال کا جواز محل نظر ہے، ''تاریخ منقول کی ہے'' کیا یہ صحیح ہے، خیر باد کو خیر آباد لکھا جانا تو یقیناً سہو کتابت ہے۔

دبستان شبلی کی فارسی خدمات : از ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۹۲، قیمت ۳۳۳ روپے، پتہ: شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، اے پی۔

دارالمصنفین یا دبستان شبلی کی علمی، ادبی، تاریخی خدمات پر کئی تحقیقی مقالے کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں، معارف پر بھی پی ایچ ڈی کے مقالے تیار ہوئے، عربی خدمات پر بھی مقالہ موجود ہے، زیر نظر کتاب پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں لیکن تلاش و جستجو اور معلومات کی وسعت اور فکر و نظر کی تازگی کی وجہ سے یہ مذکورہ کوششوں کا ہی ایک قابل قدر حصہ ہے، لائق مصنف فارسی زبان کے استاد ہیں، ان کی خوبی ہے کہ قلم و قرطاس سے رشتے کی استواری کو وہ ذرا بھی کم زور نہیں ہونے دیتے، یہ کتاب فارسی زبان سے ان کی محبت اور اس زبان شیریں کے فروغ میں دارالمصنفین کی وقعت کے اظہار کے طور پر ہے جس میں علامہ شبلی اور پیروان شبلی کی تحریروں کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد وہ تمام آثار جمع کر لیے گئے جو فارسی زبان کے تعلق سے اہم ہیں، شعر العجم، سوانح مولانا روم اور کلیات شبلی فارسی تو اظہر من الشمس

ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی فارسی اصناف سخن میں غیر معمولی دسترس کا ذکر نئی نسل کے لیے حیرت و مسرت کا سبب ہوسکتا ہے، بیس سال کی عمر میں سید صاحب کا فارسی قصیدہ ایسا ہے کہ بقول مصنف ''اس میں قصیدہ کے تمام محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں، مولانا عبدالسلام ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے علاوہ دبستان شبلی میں انہوں نے اقبال سہیل اور مولانا اسلم جیراج پوری کا شمار کیا ہے، دبستان اگر فکر و اسلوب کی ہم آہنگی کا طالب و نمایندہ ہے تو دبستان شبلی میں مولانا جیراج پوری کی شمولیت محل نظر ہے، کتاب میں اعظم گڈھ کی تاریخ پر پہلا باب معلومات سے لبریز ہے، ایک باب معارف کی فارسی نوازی کے لیے خاص ہے، مجموعی لحاظ سے یہ کتاب اپنے عنوان و موضوع سے انصاف کرتی ہے، البتہ کتابت کے اغلاط کثرت سے ہیں، مولانا مسعود علی ندوی کو مسعود احمد لکھا جانا، پروف کی تصحیح میں توجہ کی کمی سے ہے، لائق مصنف نوخیز ہوتے ہوئے بھی اب نوخیز نہیں، فارسی شعر و ادب کی ایک خصوصیت مبالغہ آرائی ہے، جس کا اثر ان کی تحریر میں اس طرح نظر آتا ہے کہ انہوں نے دارالمصنفین کے ایک ادنی ملازم کے لیے الفاظ و تعبیرات میں واقعیت و رومانیت کا فرق اٹھا دیا۔

ایمان کے تابندہ نقوش: از جناب مولانا ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۵۶، پتہ: ندوۃ التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ۔

''سب کچھ اللہ سے ہونے سے اور غیر اللہ سے کچھ نہ ہونے کا یقین دلوں میں راسخ ہو جائے تو یہی ایمان ہے'' مومن کا معاملہ اسی لیے غیروں کی نظر میں عجیب ہوتا ہے، فقیری میں شاہی کرنے اور ایک عالم کو اپنی میراث سمجھنے کی ہمت اور بے تیغ ہو کر بھی لڑنے کی جرأت، دوسروں کے لیے صرف حیرت ہے، جو صاحب ایمان نہیں وہ کیا جانے کہ مومن تو خود ہی تقدیر الٰہی ہے۔ یہ محض عقیدت کے غلو کی بات نہیں، ہر دور میں اور جگہ ایمان کی طاقت جلوہ گر ہوتی رہی ہے، فاضل مصنف اہل علم بھی ہیں اور اہل دل بھی، انہوں نے پہلے بھی ایسے واقعات کو نہایت موثر انداز میں کتاب ''ایمان ویقین کی باتیں'' میں پیش کیا، زیر نظر کتاب کا صرف نام بدلا ہے ورنہ جیسے پہلے لکھا گیا تھا کہ نفس مضمون اور قلم کی طہارت و نظافت نے ہر سطر کو ایمان و یقین کی کرن بنا دیا ہے، جس سے قلب و روح کے ظلمت کدوں میں کچھ دیر ہی کے لیے، اجالا بکھر جاتا ہے۔ افادہ عام کے لیے یہ کتاب بھی ظاہری قیمت سے مستغنی ہے۔ ناشر سے مفت طلب کی جاسکتی ہے۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- نقد فراہیؒ: محمد رضی الاسلام ندوی، کلیہ اسلام نشیمن مارکیٹ، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔ قیمت =/۱۰۰ روپے۔

۲- النور السافر: ترجمہ: ڈاکٹر محمد عارف الدین فاروقی، گجرات اور ساہتیہ اکیڈمی، تیسری منزل اولڈ اسمبلی بھون، نزد ٹاؤن ہال، سیکٹر ۱۷، گاندھی نگر، گجرات۔ قیمت =/۷۰ روپے۔

۳- ترجمہ روضۃ الاولیائے بیجاپور: مترجمہ سید شاہ سیف اللہ صاحب قادری الشطاری، درگاہ نزد جامع مسجد، بیجاپور (کرناٹک) ۵۸۶۱۰۴۔ قیمت درج نہیں۔

۴- قرآن کے چراغ: ام سلمیٰ، ادارہ تذکیر القرآن، سرائے میر اعظم گڈھ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ریسرچ سینٹر، کلن کی لاٹ، امین آباد لکھنؤ۔ قیمت =/۲۵ روپے۔

۵- ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، اردو بک ریویو، ۱۷۳۹/۳ (بیس منٹ) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت =/۱۰۰ روپے۔

۶- میزان آگہی: محمد ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئو ناتھ بھنجن۔ قیمت =/ ۲۰۰ روپے۔

۷- تذکرہ مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی: ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی، مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ، مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

۸- متاع قلم: محمد ایوب اصلاحی، البلاغ پبلی کیشنز، فلیٹ نمبر 1، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت =/۲۵۰ روپے۔

۹- جاگتے رہو: احمد سورتی، ملی پبلی کیشنز، ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی۔ قیمت =/۲۵۰ روپے۔

۱۰- جوش ملیح آبادی (فکر وفن): مرتبہ شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔ قیمت =/۳۰۰ روپے۔

۱۱- غالب کی فکری وابستگیاں: انور معظم، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔ قیمت =/۳۰۰ روپے۔

۱۲- ہندوستان میں سماجی اصلاح کی تحریکات اور ان کے اثرات: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔ قیمت =/۲۰۰ روپے۔